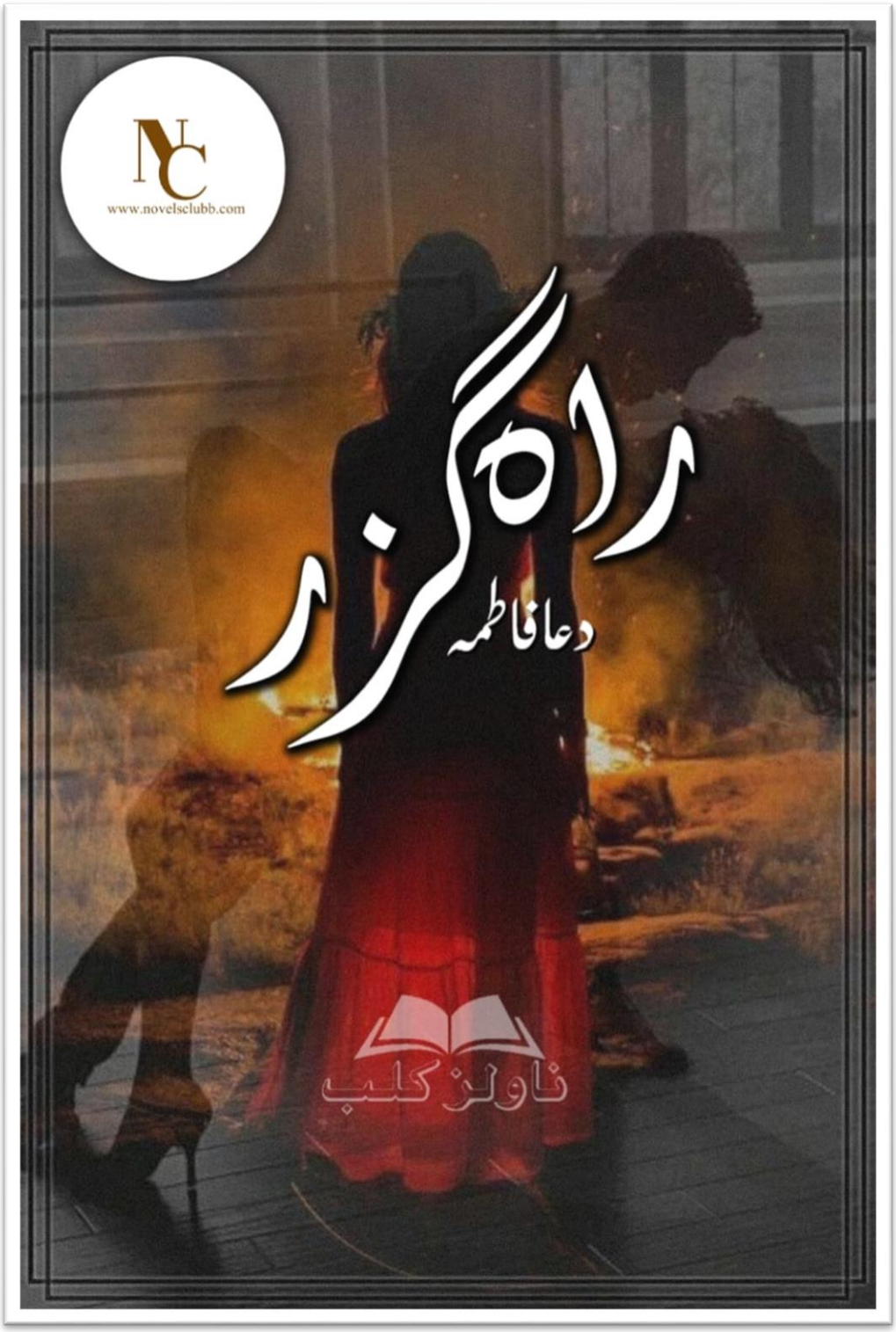
www.novelsclubb.com
راہ گزر
دعا فاطمہ
ناولز کلب

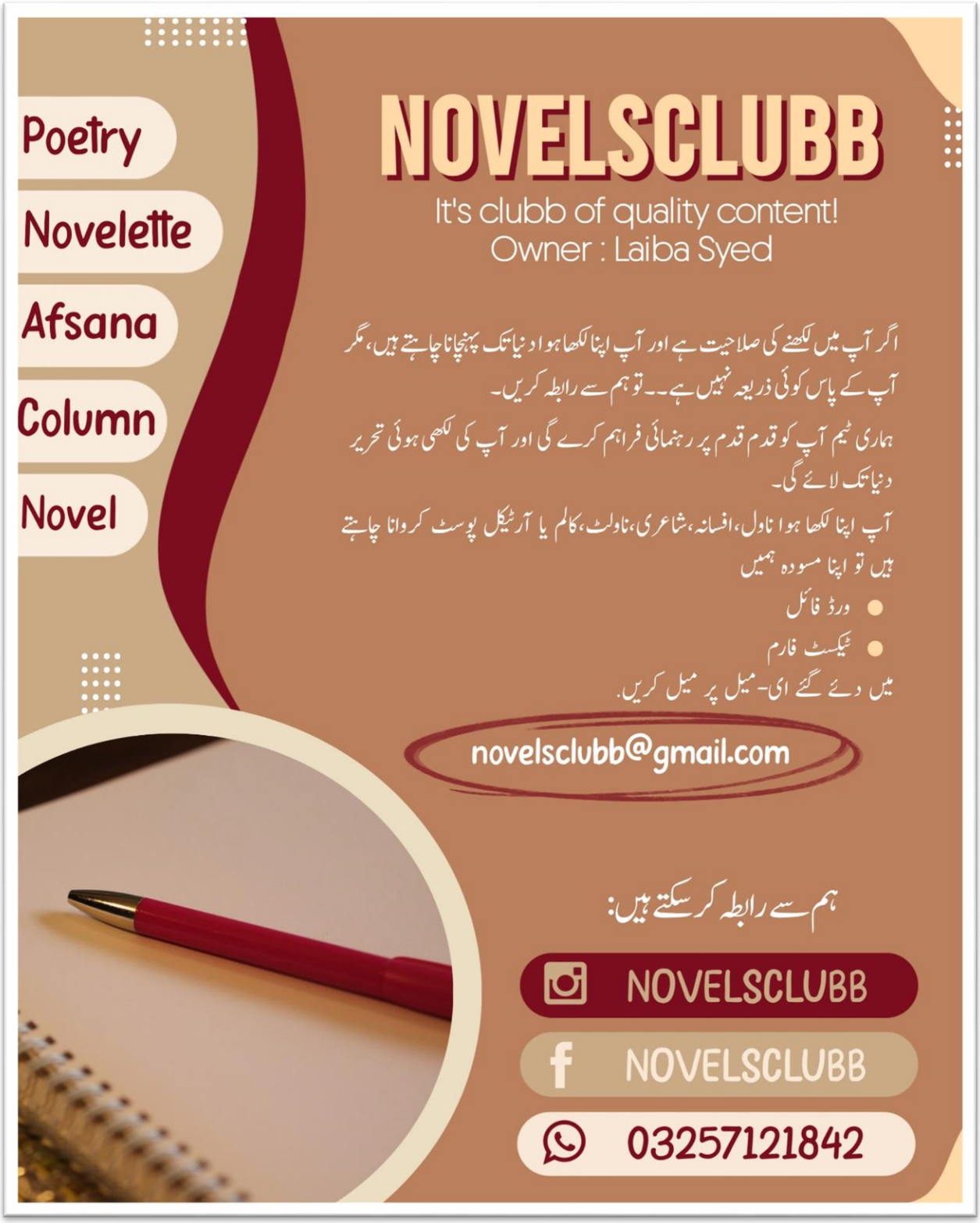
Poetry
Novelette
Afsana
Column
Novel
NOVELSCLUBB
It's clubb of quality content!
Owner : Laiba Syed
اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔
ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔
آپ اپنا لکھا ہوا ناول،افسانہ،شاعری،ناولٹ،کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں
ورڈ فائل
ٹیکسٹ فارم
میں دئے گئے ای-میل پر میل کریں.
novelsclubb@gmail.com
ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں:
NOVELSCLUBB
NOVELSCLUBB
03257121842

# راہ گزر

## از قلم

## دعا فاطمہ

www.novelsclubb.com

## انتساب

میری زندگی اور اس کی تلخیوں کے نام۔۔۔زندگی کے حقیقی چہرے کے نام۔۔۔زندگی کی تلخ گہرائیوں کے نام!

www.novelsclubb.com

## پیش لفظ

یہ کہانی ہے ایمان زاویار کی۔۔۔اس ایمان زاویار کی جو زندگی کے شروع ہوتے ہی اس کی تلخیوں سے جا ملتی ہے۔اس ایمان زایار کی جو زندگی گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنا ایمان کھو بیٹھتی ہے۔اس ایمان زاویار کی جس کی زندگی کی تلخیاں ہی اسے اس کا امیان واپس لوٹاتی ہیں۔اس ایمان زاویار کی جو صرف اپنے آپ کے ساتھ اس دنیا میں اکیلی رہ جاتی ہے۔

کہانی ہے زندگی کی۔اس زندگی کی جو اپنا خوبصورت نقاب اتار پھینکتی ہے۔اس زندگی کی جس کی بدصورت حقیقت سامنے آتی ہے۔اس زندگی کی جو انسان کو چاروں اور سے گھیرے اس کو تنہا کر ڈالتی ہے۔

کہانی ہے راتوں کو رونے والوں کی، کہانی ہے سسکنے والوں کی، کہانی ہے اکیلے رہ جانے والوں کی۔۔۔

www.novelsclubb.com

کہانی ہے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرّانے والے رمیص جہانزیب کی۔۔۔

کہانی ہے دور پردیس میں کہیں کھو جانے والے ارتضی مراد کی۔۔۔

داستان ہے غزل ارشد کی۔۔۔داستان ہے ایمان زاویار کی۔۔۔

اس کہانی کی سب سے ڈیزرونگ لکھاری میری نانی ہیں جنہوں نے میری تھیم سن کر ایک ہی بار میں مجھے میری کہانی کا نام بتا کر مجھے میری ناول کا پلاٹ، کلائمیکس اور اختتام تھما دیا۔ میری کہانی کو ایک نیا رخ بخشا۔ارشد شریف شہید کی سوانح عمری کچھ الگ لفظوں میں بیان کر کے میں نے ایک اور تھیم کو اس ناول کا حصّہ بنایا ہے۔سب سے آخر میں میری پوری کوشش ہے کہ میں اپنے ذہن میں قائم ہوئے اسباق کو باآسانی اس ناول کے ذریعے آپ تک پہنچا سکوں۔

والسلام

دعا فاطمہ

www.novelsclubb.com

# راہ گزر

## قسط4

اے ابن آدم، کیا جانتے ہو کیا ہے امید؟

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا دینے والی ہے امید

تاریکی کو روشنی میں بدلنے والی ہے امید

مسافر کو منزل تک، بیمار کو شفا تک

طائر کو فلک تک، پہنچانے والی ہے امید

بے سبب زندگی کو باسبب جو بنا ڈالے

چشمِ نابینا کو نور چشم عطا جو کرے

تاریکیٔ شب کے بعد دن کا اجالا جو لائے

www.novelsclubb.com

نم آنکھوں کو ایک پل میں جو مسکراہٹ میں ڈھالے

روتے کا صبر کی تھپکی سے جو دل بہلائے

بے لگام آنسوؤں کو جو سرعت سے پونچھ ڈالے

وہ تیغ ایمانی، وہ شمشیر ہے یہ امید

وہ خوشی ہے امید، وہ ہنسی ہے امید

کراچی کی سرزمین پر وقت فجر طلوع ہوا تو رمیص جہانزیب کے گھر میں موجود ایک کمرے کے پار کوئی سجدے میں جھکا تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کے سادہ سے شلوار قمیض کے ساتھ ہم رنگ ہی دوپٹہ چہرے کے گرد باندھے وہ بہت خاموش سی لگتی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ گویا اندر چلتا طوفان نجانے کیسے کچھ وقت کے لیے تھم سا گیا ہو۔

کمرے کی خاموشی میں پنکھے کی مدھم آواز گونجتی ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئی تھی۔ فجر کی اذان ختم ہوئے ابھی چند ہی ساعتیں بیتی تھیں۔ سجدے سے سر اٹھا کر اس نے چند آخری کلمات

www.novelsclubb.com

ادا کیے اور پھر سلام پھیر کر چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے ایک لمبی سانس خارج کی۔

اس کے عین سامنے ایک سفید سل والی شیشے کی کھڑکی تھی جس کے اس پار سے رمیص جہانزیب کے گھر کا پچھلا حصہ دکھتا تھا۔ باہر موجود سوئمنگ پول کا پانی بالکل خاموش دکھتا تھا۔ ساکن سا!

درختوں پہ ادھر سے ادھر پرندے اڑتے ہوئے چہچہاتے جا رہے تھے۔ ہر شے مناظر سحر کے سحر میں ڈوبی محسوس ہوتی تھی۔ آسمان پر گہری نیلی سی روشنائی بکھری ہوئی تھی۔ ہر شے اسی نیم اندھیرے میں گھلی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بغور ہر شے کو دیکھ کر ایک طویل سانس خارج کیا تھا اور اپنی سیاہ آنکھیں دور تک پھیلے افق پر جما دی تھیں۔

زندگی بھی بعض اوقات کیسے کیسے موڑ لیا کرتی ہے ناں؟ انسان ایک پل میں کہاں تو دوسرے میں کہاں۔ کون جانتا تھا کہ جو لڑکی چند دنوں پہلے تک حیدر آباد میں اشک بہانے میں مصروف رہا کرتی تھی، وہ آج یہاں کراچی میں رمیص جہانزیب کے گھر کے کمرے میں بیٹھی یوں ساکن و خاموش ہو گی۔ اس کے اندر باہر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

اسے یہاں آئے آج دوسرا دن شروع ہو گیا تھا۔ یہاں کچھ بھی اسے اپنا اپنا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ کسی اور سیارے یا کسی اور دنیا میں غلطی سے آ گئی ہو۔ اسے تو اپنا آپ ہی بالکل ان فٹ لگ رہا تھا۔

جبھی دھیرے سے کسی نے دروازے پر دستک دی تھی۔

"ایمان؟ اندر آ جاؤں؟"

دروازے کے پار سے غزل کی نرم سی آواز گونجی تھی۔ اس نے آنکھیں پھیر ایک نظر بند دروازے کو دیکھا تھا، پھر چہرے پہ ہاتھ پھیرتی اٹھ کر دروازے تک گئی تھی۔ لاک کھول کر دروازہ کھولا تو سامنے ہی مسکراتی ہوئی غزل کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم فجر میں اٹھتی ہو؟"

اس نے ہلکا سا مسکرا کر پوچھا اور ایمان کے اندر آنے کی جگہ چھوڑنے پر اندر چلی آئی۔ اس کے لب کل کی طرح ہی آج بھی مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔ ایمان نے بے اختیار اس کے حسین

چہرے سے نگاہیں چرائی تھیں۔

"جی، میں ساری نمازیں پڑھتی ہوں، الحمدللہ۔"

اس نے مدھم آواز میں جواب دیا تھا۔ غزل اسے دیکھتے ہوئے جا کر پلنگ پر بیٹھ گئی تو وہ بھی جائے نماز اٹھا کر تہہ کرتی آ کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"تم بتاؤ۔ اب آگے کا کیا سوچا ہے؟ پڑھنے کا شوق ہے؟"، غزل نے نرمی سے پوچھا تو ایمان کچھ ٹھہر سی گئی۔ پھر نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

پڑھنے کا شوق؟ نہیں، وہ تو اسے نہ تھا۔۔۔ مگر پھر بھی ان پڑھ تو نہیں رہنا چاہتی تھی وہ۔۔۔ آدم بھائی کی طرح لندن جا کر پڑھنے کا شوق تو اسے بھی بہت تھا۔۔۔ مگر وہ کبھی بھی پڑھائی میں بہت اچھی نہیں رہی تھی، نہ ہی گھر والوں نے کبھی پڑھنے کی ہمت بندھائی تھی، نہ ہی ابا کی جانب سے پڑھائی جاری رکھنے کی اجازت تھی اسے۔۔۔

مگر خیر پھر بھی، جیسے تیسے کر کے پڑھنے کا ارادہ تو تھا اس کا۔

www.novelsclubb.com

"کچھ خاص نہیں۔۔۔ مگر ہاں، رائٹنگ کا بہت شوق ہے۔ چھوٹے موٹے افسانے لکھتی رہتی ہوں۔"، اس نے مسکراہٹ کے ساتھ بتایا تو غزل کی آنکھوں میں واضح ستائش ابھری۔

"واہ بھئی۔ یعنی میں ایک لکھاری کے ساتھ بیٹھی ہوں۔۔۔ کبھی پبلش کروانے کا سوچا اپنی تحریریں؟"، اس نے اپنی اسی نرم مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا تو ایمان نے ہلکا سا مسکرا کر سر نفی میں ہلا دیا۔

"ابّا کو سخت چڑ تھی میرے لکھنے سے۔۔۔ کہتے تھے کہ بے حیائی کی باتیں لکھتی ہوں گی۔ دماغ خراب کرنے والی باتیں، وغیرہ وغیرہ۔۔۔"، اس نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ بات مکمل کی تو غزل حیرانی سے اسے دیکھے گئی۔

"لکھنے کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ انسان محض رومانوی کہانیاں یا فحاشی ہی لکھے۔۔۔ کچھ سبق آموز کہانیاں بھی تو لکھی جاتی ہیں۔۔۔"، وہ خاصی حیرت اور اچھنبے سے بولی تو ایمان سر جھٹک کر دھیرے سے ہنس دی۔

www.novelsclubb.com

"جانتی ہیں، غزل؟ جو لوگ آپ سے نفرت کرتے ہیں، وہ آپ کے ہر کام میں عیب نکالنے کا ایک خصوصی ہنر رکھتے ہیں۔ آپ کی ہر اچھائی کو برائی بنا کر پیش کرنے میں انہیں کوئی دقّت پیش نہیں آتی۔"، اس کا انداز سادہ مگر الفاظ بہت ظالم تھے۔ لہجہ نہایت سنجیدہ، آنکھیں بلا کی سخت۔ غزل اس کو خاموش نظروں سے دیکھے گئی تھی۔ وہ سچ کہہ رہی تھی، بالکل سچ۔۔۔ مگر۔۔۔

"وہ تو تمہارے ابّو ہیں ناں؟ وہ کیوں تم سے نفرت کریں گے؟"، وہ حیران ہوئی تھی۔ اس کا حیران ہونا بنتا بھی تھا۔

"یہ تو صرف وہی جانتے ہیں۔۔۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"، اس نے لاعلمی کے سے انداز میں شانے اچکائے اور سر جھکا گئی۔ آنکھوں میں نمی چھلکی تھی۔ غزل کچھ پلوں تک عجیب نا سمجھی والی نگاہوں سے اس کے جھکے سر کو دیکھے گئی تھی، پھر سر جھٹک کر ہلکا سا مسکرائی تھی۔

"چھوڑو ان باتوں کو۔ تم مجھے کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔ کیا کرتی ہو؟ کتنے سال کی ہو؟ کیا شوق

ہیں تمہارے؟ کراچی کیسا لگا تمہیں؟"، وہ کچھ ایکسائٹمنٹ سے بولی تو ایمان اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"اوکے۔"

اس نے کہتے ہوئے رخ پوری طرح سے غزل کی جانب موڑا تھا۔ ہاتھ گود میں دھر کر اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنا شروع کیا تھا۔

"میرا پورا نام ایمان زاویار ہے۔ میں کچھ مہینوں میں اٹھارہ سال کی ہونے والی ہوں۔ پچھلے سال میں نے انٹر مکمل کیا ہے اور اب میری شادی ہو رہی تھی، جس سے بھاگ کر میں حیدر آباد چھوڑ کر یہاں، کراچی آگئی ہوں۔"، اس کی مسکراہٹ میں آخر میں ایک تلخی سی گھلی تھی۔۔۔ بات مکمل ہونے تک غزل کے چہرے پر موجود مسکراہٹ کچھ پھیکی پڑی تھی اور آنکھوں میں الجھن سی امڈ آئی تھی۔

"واٹ؟ سیریئسلی؟"، اس کے منہ سے نکلے بھی تو محض حیرت میں ڈوبے یہ دو الفاظ۔ ایمان

نے ہنستے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

"یس۔بہت سیریئسلی!"،اس نے اثبات میں سر ہلایا تو غزل نے پہلو بدلا۔گفتگو نے کافی آکورڈ رخ لے لیا تھا۔

"آ۔۔۔کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ کیوں؟کیا تمہیں وہ لڑکا نہیں پسند تھا؟یا پھر یہ کہنا چاہیئے کہ تمہیں کوئی اور لڑکا پسند تھا؟"،سادہ اور دوٹوک انداز،اور اتنی ہی خطرناک بات!

"وہ لڑکا نہیں تھا،آدمی تھا پکا۔مجھ سے تقریبا سولہ سترہ سال بڑا۔۔۔"،ایمان نے اپنے اسی سادہ سے انداز میں کہا تو غزل کے لب اوہ میں سکڑے۔مگر ایمان کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔

"اور جہاں تک بات ہے آپ کے دوسرے سوال کی تو ہاں،مجھے کوئی اور لڑکا پسند تھا۔۔۔مگر بھاگی میں اس کی وجہ سے نہیں ہوں۔وہ تو۔۔۔"،اس نے بات ادھوری چھوڑی تو غزل نے لب سی کر سر سمجھنے کے سے انداز میں ہلایا تھا۔ایمان خاموش ہوئی تو غزل ہلکا سا مسکرائی۔

"اور یہ بتاؤ کہ آگے کا کیا ارادہ ہے؟پڑھائی مکمل کرو گی یا پھر شادی؟"،اس نے اسی نرم انداز

www.novelsclubb.com

میں جو اباپوچھا تھا۔

"نہ تو میرا پڑھائی ختم کرنے کا ارادہ ہے اور نہ ہی شادی کرنے کا۔ بلکہ میرا تو زندہ رہنے کا بھی دل نہیں چاہتا۔۔۔ جانتی ہیں کہ اب میں کیا دعا مانگتی ہوں؟"، اس کے پوچھنے پر غزل کا سر خود بخود ہی نفی میں ہلنے لگا تھا۔

"یہی کہ اب بس، بہت جی لیا میں نے۔ بہت سہہ لیا۔ بہت رو لی میں۔ اب مجھے آرام چاہیئے۔ مجھے موت چاہیئے۔"، وہ چھوٹی سی لڑکی اتنی بڑی بات کر گئی تھی، غزل سن و ششدر بیٹھی رہ گئی تھی۔ کیا کوئی دعاؤں میں موت بھی مانگا کرتا ہے بھلا؟

"پاگل ہو کیا؟ ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالنی چاہیئے۔ زندگی اللہ کی امانت ہے۔ اسے نقصان پہنچانے یا ختم کرنے کا ہمیں کوئی حق حاصل نہیں۔"، غزل کے فکر مندی سے کہنے پر وہ ہلکے سے مسکرائی تھی۔ آنکھوں کی نمی بڑھی تھی۔ پتلیوں میں سیاہ روشنائی مزید گھلی تھی۔

"جانتی ہوں۔ جبھی تو خود کچھ نہیں کرتی۔ جس کی دی ہوئی امانت ہے، اسی سے واپس لینا کا کہتی

ہوں۔یہ امانت دل پر بہت بھاری پڑنے لگی ہے۔"،اس کا انداز،اس کا لہجہ،اس کا چہرہ اتنا درد لیے ہوئے تھا کہ غزل کے دل کو کچھ ہوا تھا۔اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔زندگی کتنی ظالم ہے ناں۔کچھ لوگوں کے لیے تو خصوصاً!

کچھ پل نامحسوس سی خاموشی نے ان دونوں مجسموں کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھا۔۔۔پھر چند لمحوں بعد ان میں سے ایک مجسمہ گویا چٹخا تھا۔اس کی آنکھوں سے ایک کے بعد ایک آنسو ٹپکنے لگے تھے۔کچھ ہی پلوں میں اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔صبر کے سارے بندھ ٹوٹنے لگے تھے۔وہ یکدم ہی چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"ایمان۔۔۔"،غزل بے چینی سے اس کے قریب آئی تھی۔اس کے چہرے پر تفکر اور پریشانی کی گہری لکیریں نمایاں ہوئی تھیں۔آنکھوں میں نمی بڑھ رہی تھی۔

"میری جتنی دوسری لڑکیاں تو بہت خوش و خرّم زندگی بسر کر رہی ہیں۔زندگی ان کے لیے ایک سونے کے نوالے کی مانند ہے۔ایک نرم بستر کی طرح۔۔۔تو میرے لیے ہی کیوں خاردار بستر کی طرح ہے؟میرا کیا قصور ہے؟میری کیا غلطی ہے؟"،ایمان زاویار کافی عرصے سے غیر

خدا کے سامنے نہیں روئی تھی۔ابھی بھی نہیں رونا تھا غزل کے سامنے۔مگر یہ جو آنسو ہوتے ہیں۔۔۔یہ قابو میں نہیں آتے۔اس کے آنسو بھی بے قابو ہو کر رخسار بھگونے لگے تھے۔

غزل نرمی سے اس کا شانہ سہلانے لگی تھی۔۔۔کبھی کبھی لوگوں کو صرف ایک سامع کی ضرورت ہوتی ہے۔اور ہمیں ان کے لیے زبان کو قفل لگا کر ایک اچھا سامع بن جانا چاہیئے۔

ایمان ہچکیوں سے روتی جا رہی تھی اور وہ نم آنکھیں لیے اس کا شانہ سہلاتی،اسے تفکر سے دیکھ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ چہرے سے ہاتھ ہٹاتی منہ پونچھنے لگی تو غزل نے بھی اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔اب وہ اسے نرمی آنکھوں میں سموئے خود کو کمپوز کرتے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے کسی نے کہا تھا کہ اللہ ہمیشہ پہلا ہونا چاہیئے۔اللہ کے علاوہ کسی کے سامنے آنسو بہانا اپنی ذات اور اس کے رموز کو بے وقعت کرنا ہوتا ہے۔۔۔مگر میں کیا کروں؟خود پر کنٹرول نہیں کر پائی۔"،وہ غزل کو دیکھتے ہوئے گہری گہری سانسیں لیتی بولی تو غزل نرمی سے مسکرائی۔

"جس نے بھی کہی ہے،بہت اچھی بات کہی ہے۔۔۔مگر جانتی ہو،ایمان؟ کبھی کبھی کسی ایک

انسان کے سامنے رو لینا ہمارا دل ہلکا کر دیتا ہے۔۔۔نو پرابلم۔"،وہ نرمی سے مسکرا کر بولی تو ایمان بھی نم آنکھوں کے ساتھ ہلکا سا مسکرا دی۔

"جانتی ہو ایمان؟کسی بھی انسان کی زندگی مکمل طور پر حسین نہیں ہوتی۔زندگی کے کچھ پہلو ہوتے ہیں جو حسین ہوتے ہیں اور کچھ پہلو ایسے ہوتے ہیں جو تلخ ہوتے ہیں۔۔۔ہر کسی کی زندگی میں چند تلخیاں لازمی ہوتی ہیں۔زندگی پھولوں کی سیج کسی کے لیے نہیں ہوتی۔۔۔اور جن کو لگتا ہے کہ ان کی زندگی پھولوں کی سیج ہے،یہ اس لیے ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ان تلخ پہروں کو خود پر اور اپنی خوشیوں پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔۔۔ہر چیز کا مثبت پہلو ڈھونڈتے ہیں۔۔۔اگر زندگی جینا چاہتی ہو ایسا ہی بننا پڑے گا۔"،اس نے نرمی سے کہا تو ایمان اسے دیکھے گئی۔وہ چاہتی تھی کہ وہ کہتی جائے اور ایمان سنتی جائے۔

"دنیا میں،ہمارے ارد گرد بہت سی بروکن فیملیز ہوتی ہیں،جن کے بچّوں کی زندگی میں اسی وجہ سے ایک خلاء سا پیدا ہو جاتا ہے۔وہ پھر اسی خلاء کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔"،اس نے بات مکمل کی تو ایمان ایک بار پھر تلخی سے مسکرائی۔پھر سر نفی میں ہلایا۔

"اونہوں غزل۔میری فیملی بروکن نہیں تھی۔میری فیملی تو بہت کمپلیٹ،بہت ہیپی فیملی تھی۔ بروکن تو صرف میں تھی۔"،اور غزل رمیص یہاں لاجواب ہوئی تھی۔کیا کہتی وہ اس چھوٹی سی لڑکی کو؟اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔

"میری زندگی کے ہر روشن اور حسین باب کو میری قسمت کی سیاہی نے سیاہ کر دیا۔کوئی ایسا حصّہ نہ بچا جو شفاف و سپید ہو۔روشن و حسین ہو۔"،وہ اب سر ہلکا سا جھکا کر اپنی گود میں دھرے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو۔ہتھیلیوں کی لکیروں کو۔کیا ان میں کوئی خوشی کی لکیر موجود تھی؟

"میری زندگی میں جہاں سے بھی جو روشنی داخل ہونے لگتی ہے،میری سیاہی اسے دور دھکیل کر اس کا راستہ روک دیتی ہے۔میری زندگی میں جو حسن آتا ہے،میری بدصورتی اس حسن کو کھا جاتی ہے۔"،اور اب کے غزل بول پڑی تھی۔

"بدصورتی؟"

"ہوں۔بدصورتی۔۔۔کیا آپ کو میں بدصورت نہیں لگی؟دیکھیں میری طرف۔"،اس نے

سر اٹھا کر غزل کے چہرے پر نگاہیں جما کر کہا تو غزل اس کے شفاف و معصوم چہرے کو دیکھے گئی۔ کھلی کھلی سی گندمی رنگت، سیاہ چمکدار آنکھیں، عنابی لب، گہرے گلابی سے رخسار، تیر کمان کی سی گھنگھور سیاہ پلکیں، گہری سیاہ بھنویں۔۔۔وہ بدصورت تو کہیں سے بھی نہیں تھی۔ کس بدبخت کو وہ بدصورت لگتی تھی؟ یا پھر یہ کہنا چاہئے کہ کس اندھے کو وہ بدصورت لگتی تھی۔

"یو آر سو بیوٹی فل، ایمان۔۔۔تم پاگل ہو کیا؟ تم بدصورت ہوا گر تو میں تو پھر شاید بہت بدصورت ہوں گی۔ آئی مین، یو آر سو پریٹی۔۔۔"، وہ اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹائے بغیر بولی تو ایمان کی آنکھوں کے آگے کسی کی شہد رنگ آنکھیں گھومی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی تو ایمان کے لیے ویسی ہی ستائش ہوا کرتی تھی جیسی اس وقت غزل کی آنکھوں میں نظر آ رہی تھی۔ کیا وہ دونوں پاگل تھے یا پھر دیوانے؟ یا پھر اندھے؟

"تم سے زیادہ حسین لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی، ایمان۔"، ارتضی مراد کی نرم گرم سی آواز سماعتوں میں گونجی تو اس کی آنکھیں ایک بار پھر نم ہونے لگیں۔ گلے میں گلٹی ڈوب کر

ابھری تھی۔

ایک ہی تو شخص تھا جو اسے اپنا اپنا سا لگتا تھا۔ ورنہ تو ساری دنیا ہی پرائی لگتی تھی۔ اب وہ ایک شخص بھی اس کے پاس نہ تھا۔ قسمت بھی کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے ناں!

"ایمان۔۔۔ڈونٹ سے دس اگین۔۔۔ چلو، ناشتہ کرو چل کر۔ کم آن۔ ہم ویٹ کر رہے ہیں باہر۔"، غزل ہلکا سا مسکرا کر اس کا شانہ تھپتھپاتی اٹھ کر باہر چلی گئی تو اس نے اپنی آنکھوں کی نمی رگڑ ڈالی۔۔۔ کچھ ہی لوگ تھے جو اسے "خوبصورت" کہتے تھے۔۔۔ اور وہ خود بھی جانتی تھی کہ وہ بدصورت نہیں تھی۔۔۔ مگر دماغ اور دل میں ایک جنگ جاری تھی۔ فتح کس کی ہونی تھی، کون جانے!

www.novelsclubb.com

☆☆☆

کچھ بہادر لوگ ہوتے ہیں جو انصاف اور عدل تک جاتی سیڑھی پر قدم دھرتے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ موت بھی مقدر بن سکتی ہے۔ سوچ بھی لیتے ہیں تو ان کا فیصلہ ڈگمگاتا نہیں ہے۔ فیصلہ

ڈگمگا بھی جائے تو راہ سے بھٹکتے نہیں ہیں۔ بھٹکنے بھی لگیں تو ثابت قدمی کی کوشش کرتے ہیں۔

انہی لوگوں میں ان دنوں سر فہرست دو نام تھے، جو ہر سو چھائے ہوئے تھے۔اور وہ نام رمیص جہانزیب اور فیضان ارمغان کے تھے۔

صرف پاکستان میں ہی نہیں، بلکہ پوری دنیا میں اس وقت ایک دھوم سی مچی ہوئی تھی۔ قائم خاندان جو ملک کا مشہور ترین خاندان تھا، مگر ساتھ ہی ساتھ ذلیل ترین خاندان بھی۔اس خاندان کے دو لوگ پچھلے پندرہ سالوں سے پاکستان کی حکومت کو سنبھالتے آرہے تھے۔ مگر ابھی چند ماہ پہلے ہی اس خاندان کا اگلا پچھلا سارا ریکارڈ منظر عام پر آگیا تھا۔اور عوام کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اتنے عرصے سے ایک چور خاندان کو سپورٹ کرتے آئے تھے۔ ہر سو گالیوں کی گونج تھی۔

شہریار قائم اور اس کے بچّے پہلی فرصت میں ملک چھوڑ کر بھاگے تھے۔ پیچھے دوسرا وزیر اعظم منتخب کر دیا گیا تھا۔۔۔

پھر وقت گزرتا گیا۔وہ وزیر اعظم عوام میں مقبول ترین ہو گیا۔دنیا بھر میں اس کے دوٹوک انداز اور بہادری کے چرچے ہونے لگے۔ہر کسی کی زبان پر اس کا نام ہی ہوتا تھا۔اور ان لوگوں میں سے دو رمیص اور فیضان بھی تھے۔۔۔

رمیص جہانزیب اپنے ہر شو میں اسی کا ذکر کیا کرتا۔اس کے کارنامے اور پراجیکٹس کا اعلان کرتا۔جیسے ہو سکتا تھا،اسے سپورٹ کیا کرتا۔یہی حال فیضان ارمغان کا بھی تھا۔فیضان اور رمیص لڑکپن کے دوست تھے۔دونوں نے میڈیا انڈسٹری میں ساتھ ہی قدم رکھا تھا اور بلندیوں کی منازل بھی ساتھ ساتھ ہی طے کرتے گئے تھے۔

ایسے ہی ایک دن ملک بھر میں نو وارد وزیر اعظم کے خوب چرچے ہو رہے تھے۔آج اس کا آج تک کا سب سے بڑا جلسہ تھا،جس میں کئی شہروں کے لوگ آ آ کر شرکت کر رہے تھے۔رمیص اور فیضان بھی آج وہیں موجود تھے۔پورے وقت انہوں نے خوب نعرے لگائے اور پھر آخر کار جب گھڑیال نے رات کا ایک بجایا،تو سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

وہ ابھی ابھی بہت تھکا ہارا گھر لوٹا تھا۔ کمر اور گردن اکڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ آنکھیں بھی خمار آلود ہو رہی تھیں۔ اپارٹمنٹ کا دروازہ اپنے پیچھے بند کرتا وہ کمرے تک چلا آیا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر موبائل اور والٹ رکھا اور وارڈروب سے ہلکی پھلکی سی ٹی شرٹ ٹراؤزر نکالے وہ اب واش روم کی جانب بڑھ ہی رہا تھا کہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اس کا موبائل چنگھاڑا۔ خاموش پڑے گھر میں جیسے ایک چنگھاڑ سی گونجی تھی۔

بیزاری اور تھکاوٹ کے باعث اس نے گردن دائیں سے بائیں ڈھلکا کر تھکے ہوئے انداز میں موبائل کو دیکھا۔ پھر قدم قدم ڈریسنگ ٹیبل تک چلا آیا۔ ابھی وہ چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا کہ اسکرین پر جگمگ کرتا نام دیکھ کر اس کے اندر جیسے پھرتی سی دوڑی۔ وہ تیزی سے قریب آیا اور کال پک کر کے فون کان کے ساتھ لگایا۔

"ہیلو؟"، اس نے کچھ حیرت سے کہا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ اسے کال کر رہی تھی۔ ورنہ آج سے پہلے اگر کبھی ضرورت بھی پڑ جاتی، تب بھی وہ اسے خود کال نہیں کیا کرتی تھی۔ وہ رؤوف صاحب سے اسے کال کرواتی تھی۔

"ر۔۔۔رمیص۔۔۔آپ نے۔۔۔ٹی وی دیکھا؟"،اگلی جانب سے اس کی ہکلاتی ہوئی ڈری سہمی سی آواز گونجی تو وہ حیرت میں پڑا۔پھر سر نفی میں یوں ہلایا جیسے وہ اس کے سامنے ایستادہ اسے تک رہی ہو۔

"نہیں۔کیوں؟"

"سوشل میڈیا بھی چیک نہیں کیا؟"،اب کے اسے اس کی آواز میں واضح کپکپاہٹ محسوس ہوئی تھی۔رمیص کی تو جان ہی حلق میں اٹک گئی تھی۔کچھ نا سمجھی سے اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"نہیں۔"،جواب دیا تو اگلی جانب سے اس کی سسکی گونجی۔

"آپ کا موبائل آف تھا پورے دن سے؟"،اب کے باقاعدہ نمی گھلی محسوس ہوئی تو وہ تفکر اور پریشانی سے سر نفی میں ہلاتا بے چین ہوا۔

"جی،غزل۔مگر کیوں؟آپ کیوں پوچھ رہی ہیں یہ سب؟"،اس کو واقعتا سمجھ نہیں آیا تھا۔وہ پریشانی سے کہتا ہوا پلنگ پر بیٹھ گیا تھا۔اضطرابی کیفیت میں ناخن منہ میں دے دیئے تھے۔

"ٹی وی کھولیں، رمیص۔ واٹس ایپ چیک کریں۔ سوشل میڈیا دیکھیں۔ سب آپ سے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش میں ہیں۔"، اور اب کے اس نے کہتے ساتھ ہی فون کی لائن اگلی جانب سے منقطع کر دی تھی۔ رمیص نے نا سمجھی کے عالم میں اپنا ٹوئیٹر اکاؤنٹ کھولا تھا۔۔۔ اور وہاں سامنے ہی سامنے جو تصویر آئی تھی، اس نے رمیص جہانزیب کا سر کچھ پلوں کے لیے واقعتا چکرا کر رکھ دیا تھا۔

"رمیص جہانزیب اور ان کی شوپروڈیوسر کے درمیان کیا چل رہا ہے؟"، پوسٹ کا کیپشن یہ تھا۔ پوسٹ میں اسٹوڈیو کا وہ حصّہ تھا جو غزل ارشد کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ تصویر میں اس وقت دو لوگ کھڑے دیکھے جا سکتے تھے۔ ایک سفید نقاب میں ملبوس لڑکی جو سر اٹھائے اپنے سامنے کھڑے دوسرے شخص کو دیکھ رہی تھی اور وہ دوسرا شخص کوئی اور نہیں، بلکہ رمیص جہانزیب ہی تھا۔

اور پیروں کے نیچے سے زمین نکل جانا کیا ہوتا ہے، یہ رمیص جہانزیب کو آج پتا چلا تھا۔ کپکپاتے ہاتھ اور پسینے سے تر ہوتی پیشانی لیے اس نے موبائل پر ایک نمبر ڈائل کیا تھا اور فون کان سے

لگایا تھا۔پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹھالیا گیا تھا۔

"کہاں ہو تم،رمیص؟پورے دن سے پاگل ہوئے ہوئے ہیں ہم سب۔"،رؤوف صاحب کی غصّے بھری بے بسی والے لہجے میں کہی بات نے اس کو اپنی کنپٹی مسلنے پر مجبور کر دیا تھا۔اگر وہ پریشان تھے تو یعنی معاملہ اتنا پیچیدہ ہو چکا تھا۔

"جلسے میں تھا،بھائی۔"،اس کی تھکاوٹ سے چور آواز گونجی تھی۔رؤوف صاحب نے اگلی جانب جیسے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

"انسان موبائل تو آن رکھتا ہے،رمیص۔"،وہ دانت پر دانت جما کر بولے تھے۔رمیص نے آنکھیں ضبط سے بند کر کے خود کو پیچھے بستر پر پھینکنے کے سے انداز میں گرا دیا تھا۔

"اب کیا ہو گا،بھائی؟غزل کا کیا ہو گا؟"،اس کی آواز میں نمی گھلتی چلی گئی تھی۔آنکھوں میں بھی!رخسار،کنپٹیاں،سب سلگ رہی تھیں۔کانوں کی لوئیں تک دہکتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"وری اباؤٹ یور سیلف،رمیص۔تمہاری ریپوٹیشن۔۔۔"،اور رمیص جہانزیب نے رؤوف صاحب کی بات پہلی بار کاٹی تھی۔

"اس کی عزّت، بھائی۔اس کی عزّت۔"،اور اس کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ رؤوف صاحب بری طرح ٹھٹھک کر رکے تھے۔جیسے انہیں یقین نہ آیا ہو۔

"کیا واقعی میں ایسا ہے، رمیص؟"،ان کا لہجہ اور اس لہجہ میں پنہاں وہ شک، سیدھا ٹھاہ کر کے دل کو چیر گیا تھا۔اس نے سرخ پڑتی آنکھیں زور سے بھینچی تھیں۔

"نہیں بھائی۔۔۔وہ بے قصور ہے۔وہ معصوم ہے۔ایسا کچھ نہیں۔"، مگر رؤوف صاحب اسے نہیں سن رہے تھے۔اب وہ اپنی کہہ رہے تھے۔

"اور تم؟ وہ بے قصور ہے، مان لیا۔وہ معصوم ہے۔میں نے یہ بھی مان لیا۔۔۔مگر تم؟ کیا تم بھی اتنے ہی بے قصور اور معصوم ہو، رمیص؟"،اور اس سارے میں رمیص جہانزیب پہلی بار ہنسا تھا۔اذیت سے۔دکھ سے۔تکلیف اور بے بسی کے احساس سے۔

"میری فیلڈ کے لوگ بے قصور اور معصوم نہیں ہوتے، بھائی۔سب ایک سے بڑھ کر ایک کمینے ہوتے ہیں۔۔۔"،اگلی جانب رؤوف صاحب نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

"اب کیا کرو گے ؟پریس کانفرنس کر کے رد کرو گے تمام الزامات ؟"،وہ جانتا تھا کہ وہ پوچھ نہیں رہے تھے۔وہ اسے بتا رہے تھے کہ اسے کیا کرنا ہے۔مگر وہ رمیص جہانزیب ہی کیا جو کسی کے کہے پہ عمل کرے۔وہ بھی سوچ چکا تھا کہ کیا کرنا ہے اسے۔

"پریس کانفرنس تو ہو گی،بھائی۔مگر میں الزامات کو رد نہیں کروں گا۔۔۔آپ مجھے پرسوں تک کا ٹائم دیں۔پرسوں تک ہم میں سے کوئی بھی اس معاملے پر کچھ بھی نہیں بولے گا۔کچھ بھی نہیں۔پرسوں میں پریس کانفرنس میں سب کلیئر کر دوں گا۔۔۔اللہ حافظ۔"،اور اس نے کھٹاک سے فون رکھ دیا تھا۔اور رؤوف صاحب نے ضبط سے آنکھیں بند کر کے کھولی تھیں۔اس کی یہ فون کھٹاک سے بند کرنے والی عادت انہیں سخت ناگوار گزرتی تھی۔

ابھی اس نے پلنگ پر فون پھینک کر کنپٹیاں دبانا شروع ہی کی تھیں کہ اس کا فون ایک بار پھر بجنے لگا۔اس نے سر فون کی جانب پھیر کر اسکرین دیکھی تو کوئی غیر شناسا نمبر اسکرین پر جل بجھ رہا تھا۔ایک پرسوچ نظر اسکرین پر ڈال کر اس نے کال پک کر کے فون کان سے لگایا تھا۔

"ہیلو؟"،اس کی آواز مدھم،سرگوشی نما تھی۔

www.novelsclubb.com

"السلام علیکم، رمیص جہانزیب۔۔۔ارشد کبیر بات کر رہا ہوں۔ غزل ارشد کا والد۔"،اور اس تعارف پہ وہ پتھر کا مجسمہ بنا بیٹھا رہ گیا تھا۔آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو کر ایک نقطے پر ٹھہری رہ گئی تھیں۔سانس ایک لمحے کے لیے رکا تھا۔

**ایک دن بعد۔۔۔**

یہ ایک پریس کانفرنس کا منظر تھا۔ہال رپورٹرز اور دوسرے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ہر جانب کیمرے کی فلیش لائٹز چمکتی آنکھوں کو چندھیانے پر مجبور کیے دے رہی تھیں۔ان تمام رپورٹرز،مائیکس اور کیمروں کے درمیان رمیص جہانزیب بیٹھا، سر اٹھائے ایک ادا اور ناز سے سب کو دیکھ رہا تھا۔اس کے عین سامنے پوڈیم پہ مائیکس کا ڈھیر لگا تھا۔ہر جانب ایک شور و غل سا مچا محسوس ہوتا تھا۔۔۔جبھی کانفرنس کا آغاز کیا گیا تھا۔ایک دم سے ہال میں گہری خاموشی چھا گئی تھی۔رپورٹرز کے جم غفیر کے درمیان ایک کم عمر رپورٹر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ہاتھ میں مائیک تھام رکھا تھا۔

"کیا آپ بتائیں گے کہ آپ پر لگے وہ تمام الزامات سچ ہیں یا پھر ایک گھناؤنی سازش؟"

رمیص نے اطمینان سے چہرہ موڑ کر اس لڑکے کو دیکھا تھا۔ چاہے یہ معاملہ بہت بڑا اور سنگین تھا، مگر اس رپورٹر کے لہجہ اور انداز میں پنہاں وہ احترام اور عزّت اب بھی برقرار تھی۔ رمیص جہانزیب عوام کا لاڈلا جرنلسٹ تھا۔ عوام اس کی عزّت میں کبھی کوئی کمی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرایا تو رپورٹر بھی مسکرا دیا۔

"آپ سب کو جو سوال کرنے ہیں، باری باری کر لیں۔ میں سب کا جواب ایک ساتھ، ایک ہی وقت میں، ایک ہی جملے میں دوں گا۔"، ہال میں اس کی پر سکون، طمانیت بھری آواز گونجی تھی۔ اس کا اعتماد اور اطمینان قابل ستائش تھا۔ اس کا انداز قابل دید تھا۔ ہر کوئی اس کے ہر ہر انداز پر حیران تھا۔

www.novelsclubb.com

"کیا یہ سچ ہے کہ آپ کی شوپر وڈیوسر، غزل ارشد کے ساتھ آپ کے تعلقات ہیں؟"، ایک اور فی میل رپورٹر کھڑی ہوئی بولی تھی۔ رمیص اب بھی شانت تھا۔

"رمیص جہانزیب، آپ عوام کے پسندیدہ جرنلسٹ، دوٹوک بات کرنے والے، ظلم کے

خلاف آواز اٹھانے والے شخص ہیں۔ عوام چاہتی ہے کہ آپ پر لگے تمام الزامات کو رد کر دیا جائے تاکہ آپ کا امیج بحال ہو جائے۔"، ایک اور معمر رپورٹر نے کھڑے ہو کر کہا تو وہ ہلکا سا مسکرایا۔ سوالوں کی بوچھاڑ ہو گئی تھی۔ ایک کے بعد ایک رپورٹرز کھڑے ہوتے، اپنے اپنے سوال برسا رہے تھے۔ وہ خاموشی سے سب کے سوال سنتا جا رہا تھا۔

("یہ اتنا مطمئن کیوں ہے، سلیم؟"، پرتعیش سے لونگ روم کے وسط میں رکھے صوفے پر بیٹھا وہ شخص کڑواہٹ سے ٹی وی اسکرین پر نظر آتے رمیص جہانزیب کو دیکھتا اپنے سیکریٹری سے پوچھ رہا تھا۔ بازو صوفے کی پشت پر پھیلا رکھے تھے۔ چہرے پر ناگواری اور آنکھوں میں نفرت ہلکورے لے رہی تھی۔

www.novelsclubb.com

"پتا نہیں، سر۔"، اس کے سیکریٹری نے ناسمجھی اور لاعلمی سے کہا تو ذوالفقار بٹ صاحب نے ایک ناپسندیدگی بھری نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔)

"آپ سب کے سوالات اور کنسرن میں نے سن لیے۔"، اب کے اسپیکرز میں رمیص کی نہایت ٹھہری ہوئی، پرسکون سی آواز گونجی تھی۔ چہرے پر ایک نرم سی مسکراہٹ تھی۔ سنہری

آنکھوں میں ایک الوہی سی چمک رقصاں تھی۔ تمام رپورٹرز چپ سادھے، سانس روکے اسے سننے کے منتظر تھے۔ رمیص نے چہرہ مائیکس کے بالکل قریب کیا تھا۔اور پھر اس کی ٹھہری ہوئی آواز ایک بار پھر گونجی تھی۔

"آج میں ایک اہم اعلان کرنے آپ سب کے سامنے حاضر ہوا ہوں۔۔۔ جس سے تمام سوالات، تمام الزامات رد ہو جائیں گے۔"

(ٹی وی اسکرین کے سامنے بیٹھے ارشد صاحب سنجیدہ مگر مطمئن نظر آتے تھے۔ وہ غزل کا ہی عکس تھے، اس کے جیسے ہی۔ ہیزل رنگ آنکھوں میں ایک ٹھہراؤ سا تھا۔ ہاتھ صوفے کی پشت پر پھیلا رکھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے کیا کیا ہے۔اور یہ بھی جانتے تھے کہ جو کیا ہے، صحیح کیا ہے۔)

"میرے اور میری شوپروڈیوسر، غزل ارشد کے درمیان کوئی ناجائز تعلق نہیں ہے۔ وہ میرے لیے بہت قابل احترام، بہت قابل اہمیت ہیں۔"، وہ اب بھی کہہ رہا تھا۔ ہال میں خاموشی چھائی

تھی اور اس خاموشی کو توڑتی رمیص کی پر سکون سی آواز تھی۔ کیمرا زاس کے بیان ریکارڈ کر رہے تھے۔ ملک میں کئی جگہوں پر ٹی وی کی اسکرین پر یہ پریس کانفرنس لائیو جا رہی تھی۔ سب اسے ہی سن رہے تھے۔

(زاویار احمد صاحب کے گھر کے لاؤنج میں بھی سناٹا چھایا تھا۔ ایمان، فاطمہ، رضیہ بیگم اور شانزے لاؤنج میں ہی بیٹھیں، دم سادھے ہوئی تھیں۔ سب کی نظریں ٹی وی پر مرکوز تھیں۔ ٹی وی پر وہی ایک انسان نظر آ رہا تھا۔ وہی سنہری آنکھوں اور بھورے سنہرے بالوں والا شاندار سا انسان!)

"غزل ارشد سے میرا کوئی ناجائز تعلق نہیں ہے۔ بلکہ ایک حلال، جائز تعلق ہے۔"

(اپنے اپارٹمنٹ کے لاؤنج میں بیٹھی غزل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے وہ ان پچھلے چند دنوں میں بہت روئی ہو۔۔۔ مگر ایک اطمینان بھی جھلکتا تھا اس کی متورم آنکھوں میں۔۔۔ جیسے آج تکلیف اور اذیت کا اختتام ہو گیا ہو۔ جیسے آج تمام الزامات کا انت ہو

گیا ہو۔۔۔ جیسے آج سکون ہی سکون ہو، راحت ہی راحت ہو۔)

"آج میں تمام لوگوں کے سامنے، اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ غزل ارشد میری بیوی ہیں۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی ناجائز تعلق کبھی تھا ہی نہیں۔ ہمیشہ سے ایک عزّت، ایک احترام کا تعلق تھا۔۔۔ جواب ایک ایسے تعلق میں بندھ گیا ہے جس پر کوئی بات، کوئی الزام صادق نہیں اتر سکتا۔۔۔ غزل رمیص میری بیوی ہے۔ اور اس کی عزّت میرا فرض ہے۔"، اور اس وقت ملک کی بہت سی لڑکیوں کے دل بری طرح ٹوٹے تھے۔ رمیص جہانزیب اب بھی کہہ رہا تھا۔

"دشمنوں کو چاہیئے کہ اپنی کرپشن ختم کر کے عوام کی خیر کے لیے کام کریں۔۔۔ سب جانتے ہیں کہ یہ کس کا کام تھا۔۔۔ اور جس کا بھی کام تھا،"، اس نے اپنی آنکھیں ایک کیمرے میں گاڑھی تھیں۔ چہرے کی مسکراہٹ ویسے ہی برقرار تھی۔ "وہ جان لے کہ وہ رمیص جہانزیب کے پاؤں کاٹ تو سکتا ہے، مگر اس کے قدم ہلا نہیں سکتا۔ میرے قدم اس مٹی سے جڑے ہیں۔ اس ملک کی مٹی سے۔ اس ملک کی فلاح و بہبود کے لیے۔ میرا لیڈر اللہ ہے اور میرا راستہ جہاد ہے۔۔۔"

(زوالفقار صاحب کی آنکھیں شدّت ضبط سے سرخ پڑ کر دہک رہی تھیں۔ٹی وی کی اسکرین پر نظر آتا وہ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کسی سنہری آنکھوں والے شیر کی مانند غرّا رہا ہو۔انہیں بتا رہا ہو کہ وہ ناکام ہو گئے ہیں۔انہوں نے مٹھیاں ضبط سے بھینچ لی تھیں۔)

"جانتے ہیں آپ سب؟ جہاد کی ایک قسم جہاد بالسان ہے۔۔۔زبان سے جہاد۔ ہمیں ہر ممکن طریقے سے جہاد میں اپنا حصّہ ڈالتے رہنا چاہیئے۔چاہے وہ نفس سے جہاد ہو، قلم سے، مال سے، زبان سے یا پھر تلوار سے۔"،رمیص اب کے سانس لینے کے لیے رکا تھا۔

"دشمن اتنا گھٹیا تھا کہ ایک پاکیزہ، پردہ دار عورت کے کردار پر بولنے سے بھی باز نہیں آیا۔۔۔ وہ جو اپنے آپ کو ساری دنیا سے چھپائے پھرتی تھی، اسے ایک لمحے میں سب کے سامنے لے آیا۔۔۔"،اب کے اس نے چبا چبا کر اگلے الفاظ ادا کیے تھے۔

"میرا دشمن سن لے کہ تم اس دنیا کے گھٹیا ترین انسان ہو۔۔۔تم سے بڑا گھٹیا شخص میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔"

(غزل نے سکون سے آنکھیں موند کر سر صوفے کی پشت پر گرا دیا تھا۔آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکلتے گالوں پر بہہ چلے تھے۔یہ تشکر اور احسان کے آنسو تھے۔اس کا شوہر،اس کا محرم،اب بھی ٹی وی کی اسکرین پر بولتا چلا جا رہا تھا۔سب لوگ خاموش تھے۔اللہ نے اس کی حفاظت کی تھی۔اس کی عزّت کی حفاظت کی تھی۔اور پھر نمرہ احمد نے کہا ہے ناں کہ جنّت کے پتّے تھامنے والوں کو اللہ رسوا نہیں کیا کرتا۔۔۔

اللہ نے اسے بھی رسوائی سے بچا لیا تھا۔

اس کے لیے ایک مضبوط محافظ بھیجا تھا۔

اس کے لیے رمیص جہانزیب کو چن لیا تھا۔

اسے کل غزل ارشد سے غزل رمیص بنا دیا تھا۔

اور یہ نام اس کے نام کے ساتھ جڑا اسے اعزاز بخش رہا تھا۔

اور اسے یہ اعزاز بے حد عزیز تھا!)

www.novelsclubb.com

"افسوس کہ آج کل لوگ بھول گئے ہیں کہ کسی کے کردار پر بہتان لگانا کبیرہ گناہوں میں سے ایک ہے۔۔۔کسی کے کردار کو داغدار کرنے کا کوئی حق کسی کو بھی نہیں پہنچتا۔۔۔کسی کو بھی نہیں۔اور عزّت کی حفاظت کرنے والا اللہ ہے۔کسی بھی انسان کے پاس اتنی قابلیت نہیں کہ کسی کو بھی بے عزّت ورسوا کر سکے۔۔۔آج کل کے زمانے کے لوگوں نے کسی کے کردار پر بولنا بہت عام بنالیا ہے۔جو نہیں پسند،اس کے کردار کی دھجیاں اڑادو،تسکین مل جاتی ہے۔۔۔سکون مل جاتا ہے۔جو عزّت اللہ نے انسان کو بخشی ہے،وہ چھیننے کا حق کسی غیر اللہ کو نہیں پہنچتا۔ہمیں یہ بات سمجھنے سیکھنے کی بہت ضرورت ہے۔"

(ٹی وی کی اسکرین پر رمیص جہانزیب کو دیکھتی،اس کو سنتی ایمان زوایار کی آنکھوں میں بہت سے آنسو جمع ہو گئے تھے۔یہ بات سیدھا سینہ چیرتی دل کو جا کر لگی تھی۔کسی انسان کی عزّت چھیننے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔کسی انسان کی تذلیل کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔کاش یہ بات اس کا باپ بھی سمجھ جائے۔کاش کہ اللہ کی بنائی ہوئی مخلوق میں عیب نکالنے والے نامکمل انسان یہ جان لیں کہ وہ اس مخلوق کے خالق کے ایک کن کی مار ہیں اور ان کا یہ سارا غرور،یہ

سارا تکبر ایک پل میں خاک میں مل سکتا ہے۔

ہاہ! کاش!

انسان کو بھی یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر اللہ نے آپ کو بنایا ہے، تو یعنی آپ خوبصورت ہیں۔ اللہ نے آپ کو بنانا پسند کیا ہے، جبھی آپ کو بنایا ہے۔ اور اللہ کی پسند کے آگے ان خاک کے پتلوں کی کیا اہمیت؟)

"مجھے بس یہی کہنا تھا۔ اللہ حافظ، پاکستان۔ اپنا خیال رکھئے گا۔"، اور وہ ہلکے سے ہاتھ ہلاتا، اب کے کھڑا ہو گیا تھا۔ پورا ہال تالیوں کی گونج سے تھر تھرا گیا تھا۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے کہ جن پر ہوائیں بھی فخر کرتی ہیں۔ جن کے لیے فضائیں بھی نعریں لگاتی ہیں۔ در و دیوار بھی ان کی شجاعت پر مسکراتے ہیں۔ رمیص جہانزیب بھی ایسے ہی کچھ لوگوں میں سے تھا!

عوام کا لاڈلا، عوام کار میص جہانزیب!

☆☆☆

پریس کانفرنس کے فورا بعد وہ سیدھا غزل کے اپارٹمنٹ آیا تھا۔اس وقت وہ اپارٹمنٹ کے باہر کھڑا گیٹ کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جبھی اگلی جانب سے کچھ مدھم سے قدم دروازے کی جانب آتے سنائی دیے تھے۔وہ خاموش سا کھڑا دروازے کی بھوری لکڑی کو دیکھ رہا تھا۔سنہری آنکھوں میں نرمی پنہاں تھی۔

ڈور ناب گھمایا گیا تھا اور اگلے ہی پل ایک کلک کی آواز کے ساتھ دروازہ اندر کی جانب کھلتا چلا گیا تھا۔وہ دروازے کے پار، ہاتھ سے اپنے سیاہ دوپٹے کا نقاب چہرے پر لگائے، اسے دیکھتے ہی کچھ حیران ہوئی تھی۔وہ شاید اس کی اتنی جلدی یہاں آنے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"مے آئی کم ان؟"، رمیص نے بہت ہی نرمی سے سر ہلکا سا جھکائے اس سے پوچھا تو وہ یکدم ہی جیسے کسی ٹرانس سے باہر آئی۔پھر سر جھٹکتی ایک طرف کو ہو گئی اور اس کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہلکے سے سر ہلاتا قدم اندر بڑھا گیا تھا۔اس کے اندر آتے ہی غزل نے پیچھے سے دروازہ لاک کیا تھا۔وہ اب قدم قدم چلتا لاؤنج کی جانب بڑھ رہا تھا۔چال میں فخر سا تھا۔قدم متوازن تھے۔ ہاتھ پہلو میں لہرائے وہ لاؤنج کے وسط میں پہنچ کر ایک دم سے اس کی جانب مڑا۔

وہ جو اس سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی، یکدم ہی رکی۔ ہیزل رنگ آنکھوں میں نروسنس تھی۔ ایک دن میں اتنا کچھ بدل جائے گا، اس نے سوچا نہیں تھا۔ وہ غزل ارشد سے غزل رمیص بن جائے گی، یہ تو اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔

"کل میں نے آپ سے ایک بات کہی تھی، غزل۔ یاد ہے آپ کو؟"، رمیص نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بہت ہی نرمی سے پوچھا تھا۔ خاموش پڑے گھر میں ان دونوں کے علاوہ محض گھڑی کی سوئیوں کی ٹک ٹک کی آواز گونج رہی تھی۔ غزل نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"جی، یہی ناں کہ آپ پریس کانفرنس کے بعد میرا چہرہ دیکھیں گے؟"، اور رمیص نے سر ہلایا تھا۔ اس نے غزل کے پردے کی ہمیشہ عزّت کی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھنے کی خواہش اس کے اندر کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ مگر کل جب یہ خواہش پیدا ہوئی بھی تو اس کو اپنا محرم بنانے کے بعد۔ اس کو اپنے نکاح میں لا کر۔ اور غزل رمیص کو اس کی یہ بات بے حد پسند آئی تھی۔

ہمارے معاشرے کا یہ عام المیہ ہے کہ جو عورت پردہ کرتی ہے، اس کو دیکھنے کے لیے سب

متجسس ہوتے ہیں۔یہ تجسس بھی ان کے پردے کے تقدس کے خلاف ہوتا ہے۔مگر رمیص جہانزیب ایسا نہیں تھا۔۔۔یہی تو اس کی خاص بات تھی۔وہ اس کے پردے اور اس کے تقدّس کی بھی اتنی ہی عزّت کیا کرتا تھا جتنا کہ خود اس کی!

غزل نے ہاتھ سے تھامے دوپٹے کو دھیرے سے چھوڑ دیا تھا۔دوپٹہ جونہی چہرے سے نیچے گرتا گیا،رمیص جہانزیب کی نگاہیں ساکت ہوتی گئیں۔وہ چند پلوں کے لیے سانس لینا واقعی بھول گیا تھا۔اس نے اتنا کامل حسن آج تک نہ دیکھا تھا۔اتنی خوبصورت عورت اس نے آج تک نہ دیکھی تھی۔اسے آج تک کوئی اتنا حسین نہیں لگا تھا۔اس کے پہلو میں گرے ہاتھ ہلکی سی لرزش کا شکار ہوئے تھے۔وہ خوبصورت روح کی مالک تھی۔مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ خوبصورت چہرے کی بھی مالک ہے۔

رمیص کو متوجہ اس کی شخصیت نے کیا تھا۔مگر آج اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ صرف توجہ نہیں تھی۔وہ تو محبت تھی۔جو محبوب کا چہرہ دیکھے بغیر ہی ہو گئی تھی۔

اور جیسے کہ یہ بات ہم پہلے ہی کر چکے ہیں کہ محبت ہر شے سے بالاتر جذبہ ہوتا ہے۔ کسی کا حسن اور بدصورتی اس پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔اور آج اسے اس بات کا اندازہ ہوا تھا کہ اس کی محبت بھی غزل ارشد کے حسن سے بالاتر تھی۔وہ بدصورت بھی ہوتی تو بھی اسے خوبصورت ترین لگتی۔

اور آج تو وہ غزل ارشد نہیں، غزل رمیص تھی۔رمیص کا نام اس کے نام کے ساتھ جڑا تھا اور یہ اس کے لیے بہت فخر کی بات تھی۔اور رمیص جہانزیب کو اپنا یہ فخر بہت عزیز تھا!

☆☆☆

www.novelsclubb.com

**حال۔۔۔**

وہ تہجد کے پہر ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے آج پھر اسے بہت شدّت سے یاد کر رہی تھی۔آنکھوں میں نمی تھی مگر چہرے پر مسکراہٹ تھی۔وہ رمیص کو کبھی بتا نہیں سکی تھی کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی تھی۔وہ اسے بتا نہیں سکی تھی کہ وہ اس سے کتنا عشق کرتی تھی۔وہ رمیص کو بتا نہیں

سکی تھی کہ رمیص جہانزیب کا ساتھ اس کے لیے ایک اعزاز تھا۔

مگر وہ جانتی تھی کہ وہ یہ بات جانتا تھا۔ وہ اس کی محبت سے واقف تھا۔ وہ اس کے ہر ایک جذبے سے واقف تھا۔ وہ اس کے عشق سے واقف تھا۔ وہ جانتی تھی!

وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھے گئی تھی۔۔۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان ہاتھوں میں رمیص جہانزیب کے ہاتھ نظر آنے لگے تھے۔ اس کے زرد، پتھر جیسے ہاتھ۔ اس کے زخمی، بے حرکت ہاتھ۔ اس کو وہ ہاتھ آج بھی خوفزدہ کر دیا کرتے تھے۔ اسے آج بھی اس کی زخمی انگلیاں یاد تھیں۔ اسے آج بھی وہ اکھڑے ناخنوں کی جگہیں یاد تھیں۔ وہ کیسے بھول سکتی تھی ان ہاتھوں کو۔

وہ اس کے سائبان کے ہاتھ تھے۔ وہ اس کے رمیص کے ہاتھ تھے۔ اسی رمیص کے جس نے کبھی اس سے ہمیشہ ساتھ رہنے کے وعدے نہیں کیے تھے۔۔۔ شاید وہ جانتا تھا کہ وہ واقعی اس کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہے گا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ دائمی ساتھ صرف جنّت میں ہوتا ہے۔ دنیا کے لوگ ساتھ نہیں رہتے۔ رہ بھی لیں تو ہمیشہ نہیں رہتے۔ رہنا چاہیں بھی تو قسمت ہمیشہ ساتھ

www.novelsclubb.com

رہنے نہیں دیتی۔اس راہ گزر کے ہم راہی آگے جا کر دوسرا موڑ مڑ لیتے ہیں۔اور پیچھے انسان اکیلا رہ جاتا ہے۔

انہی تکلیف دہ یادوں کے سمندر کے ساتھ۔جس کی موجیں انسان کو کبھی کہاں پٹختی ہیں تو کبھی کہاں۔

"یااللہ!"،اس کی نم آواز کمرے میں گونجی تھی۔اے سی کی مدھم سی آواز میں ارتعاش پیدا ہوا تھا۔وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتے اب اسی نرمی سے مدھم لہجے میں کہتی جا رہی تھی۔"مجھے ہمّت دے،یارب۔استقامت اور ثابت قدمی دے۔رمیص ہی کے جیسی بہادری اور شجاعت عطا کر۔اس ہی کی طرح نڈر پن عطا کر۔اس کی بیوی ہونے کا حق نبھانا چاہتی ہوں میں،یارب۔ میری مدد فرما۔میری پشت کو سنبھال لے۔میری گردن کو اٹھا دے۔میرے بازوؤں کو قوّت بخش۔"،وہ کہتی جا رہی تھی اور گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔کمرے کی کھڑکی پر لگے دیوار گیر پردوں کے پار رات کا اندھیرا پوری طرح چھایا ہوا تھا۔چاند آج نظر نہ آتا تھا۔ بادلوں نے آسمان کو ڈھک رکھا تھا۔ٹھنڈک کافی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔شاید آج رات بھی

ان بادلوں کا برسنے کا ارادہ تھا۔

مون سون کا وہ وقت آن پہنچا تھا جو سرد ترین ہوا کرتا ہے۔ جس میں ٹھنڈک بالکل سردیوں کی ٹھنڈک کی مانند لگتی ہے۔ مگر ہم اکثر بھول جاتے ہیں کہ مون سون کا وہ عارضی سا سرد وقت گزر جاتا ہے۔اس کے بعد پھر گرمائش کا ایک زور چلتا ہے۔انسان کے اندر جمی برف کو پگھلانے کے لیے۔ سرد وقتوں کے بعد گرمائش کی آغوش دینے کے لیے۔

مگر کون جانے کہ وہ وقت کب آنا تھا!

ان دونوں کی زندگی میں!

غزل رمیص اور ایمان زاویار کی زندگی میں!

وقت کے سرد رویے کو پگھلانے کے لیے!

☆☆☆

ہسپتال کا وہ سفید روشنی میں نہایا کمرہ سوگواریت میں ڈوبا ہوا تھا۔رات کا تیسرا پہر چل رہا تھا۔وہ

www.novelsclubb.com

ہسپتال کے بستر پر پژمردگی سے تکیوں کے سہارے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ویران آنکھیں سامنے کھڑی خاموش سی لڑکی کو تک رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر چند جگہوں پر گہرے نیل کے نشان صاف واضح تھے۔ ہونٹ کا کنارہ بھی سوجا ہوا تھا۔ سر کے گرد بندھی پٹی اور بازو پہ لگے پلستر سے یہ اندازہ لگانا کافی تھا کہ وہ شدید زخمی ہے۔۔۔ شاید بیرونی طور پہ بھی اور۔۔۔ شاید اندرونی طور پہ بھی!

اس کے زرد پڑے چہرے پر سوکھے آنسوؤں کے نشانات تھے۔ وہ پہلے سے بہتر تو نہیں، البتہ اٹھ بیٹھنے کے قابل ضرور تھا۔ اس کے عین سامنے کھڑی حسنہ اسی خاموشی سے سیب کاٹ کر پلیٹ میں رکھتی جا رہی تھی۔ کمرے کی دیوار پہ لگی گھڑی اس وقت رات کے چار بجا رہی تھی۔ ان دونوں کی ہی نیند اڑی ہوئی تھی۔ سیب کی کاشیں پلیٹ میں رکھتے، وہ گھوم کر اس تک آئی تھی، اور پھر کرسی گھسیٹ کر اس کے پلنگ کے قریب رکھی۔ وہ خاموش نظروں سے اسے تکتا جا رہا تھا۔

اب وہ اس کے ساتھ بیٹھی سیب کی ایک قاش ہاتھ میں تھامے اس کی جانب بڑھا رہی تھی۔

روحان نے ایک نظر قاش کو دیکھنے کے بعد منہ آگے کر کے قاش منہ میں لی تھی۔

"اب تم ارتضی بھائی سے کوئی رابطہ نہیں رکھو گے۔"، وہ سیب کھاتے کھاتے ایک پل کو ٹھہرا تھا، سنجیدگی سے بھرپور آنکھیں حسنہ کے سنجیدہ چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ اس کی دلی کیفیت سے واقف تھا۔۔۔ اور اپنی دلی کیفیت سے بھی!

چہرہ پہ ایک تکلیف دہ تاثر ابھر کر معدوم ہوا تھا۔ پھر اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ میں کوئی رابطہ نہیں کروں گا۔ اور اگر اس نے کوئی رابطہ کیا تو؟ اس سے کیا کہوں گا؟"، وہ اب کے سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ حسنہ نے سنجیدہ ویران آنکھیں اس کے چہرے پر ٹکائی تھیں۔

www.novelsclubb.com

"تو پھر مجھ سے بات کروا دینا۔ میں ان سے صحیح طریقے سے بات کر لوں گی۔"، اس کے لہجے کی سختی روحان کو خوب محسوس ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ گہری اذیت کا شکار ہے۔ اور اس سے زیادہ اذیت میں وہ خود تھا۔ یہ احساس کہ اب وہ کبھی چل نہیں پائے گا، بہت جان لیوا تھا۔ روح جھنجھوڑ دینے والا، دل دہلا دینے والا تھا۔

"تم اس سے کچھ نہیں کہو گی، حسنہ۔"، مگر اب بھی وہ بولا تو لہجے میں ایک منّت سی تھی۔ جیسے وہ ارتضی کو پریشان نہ کرنا چاہتا ہو۔ اس کی بات پر حسنہ نے لب بھینچ کر چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔ چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

"کیوں؟"، وہ غرّائی تھی۔ "کیوں نہ کہوں میں انہیں کچھ؟ میں تو کہوں گی، روحان۔۔۔ اور تم مجھے کچھ بھی کہنے سے نہیں روک سکتے۔۔۔ سنا تم نے؟"، وہ بلند آواز میں تکلیف کی شدّت سے بولتی جا رہی تھی۔ آنکھوں میں جھلکتی نمی اب آنسو بن کر رخساروں پر بہہ چلی تھی۔ اس کے اندر باہر اذیت ہی اذیت پھیلی تھی۔ وہ کیسے چپ کرتی؟ وہ کیسے کچھ نہ کہتی؟

"حسنہ۔۔۔ میری بات سمجھ نہیں آئی تمہیں؟"، اب کے روحان کی زکام زدہ سی آواز میں سختی در آئی تھی۔ وہ لب بھینچے سخت لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا۔ حسنہ نے ہاتھوں کی پشت سے بے دردی سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالی تھیں۔

"ان کی وجہ سے تم اس حال میں ہو، روحان۔۔۔ میرا شوہر مرتے مرتے بچا ہے۔ میرا شوہر ان کی وجہ سے ساری زندگی چل نہیں پائے گا۔ اس کی نارمل لائف اب ایب نارمل ہو گئی ہے۔

میری زندگی کو جس شخص نے تہس نہس کر کے رکھ دیا، تم چاہتے ہو کہ میں اسے کچھ نہ کہوں؟ چپ کر کے بیٹھ جاؤں؟"، بولتے بولتے اس کا سانس چڑھ گیا تھا۔ وہ ہانپنے کانپنے لگی تھی۔ آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ روحان نے ایک گہرا سانس لے کر ہاتھ تکلیف سے آگے بڑھا کر اس کا کپکپاتا ہاتھ تھاما تھا۔۔۔ پھر وہ یونہی اس کا ہاتھ تھامے اسے چند پلوں تک دیکھے گیا تھا۔

"اس کی وجہ سے کچھ بھی نہیں ہوا ہے، حسنہ۔ اس میں کسی کی بھی غلطی نہیں ہے۔ یہ میری قسمت میں لکھا تھا۔ اور قسمت کا لکھا ہم نہیں بدل سکتے۔۔۔ یہ سب ایسے ہی ہونا تھا۔۔۔ اگر اللہ نے میری قسمت میں صحت و شفاء لکھی ہو گی، تو مجھے مل جائے گی۔ اگر نہیں لکھی ہو گی تو نہیں ملے گی۔ قسمت کے کھیل انسانوں کے ہاتھوں میں نہیں ہوا کرتے۔ یہ اس ہستی کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں جو قسمت بنانے، سنوارنے، اور پھر بگاڑنے پر قادر ہے۔"، وہ مدھم، آنچ دیتے لہجے میں کہتا جا رہا تھا اور وہ بہتی آنکھیں لیے اسے شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھتی جا رہی تھی۔ یوں جیسے اسے اس کے اس اطمینان پر شدید گلہ ہو۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟ کیا مجھے دکھ نہیں؟ مجھے کوئی اذیت، کوئی تکلیف نہیں ہے؟ دیکھو حسنہ۔ میں

www.novelsclubb.com

تمہیں سمجھتا ہوں۔ تم بھی تو مجھے سمجھو۔ مجھے اس سب کو قبول کرنے میں وقت لگے گا۔ یہ ٹراما بہت بڑا ہے۔ تم اس کو ہیل کرنے اور میری ہمّت بڑھانے میں میری مدد کرو۔ نہ کہ یہ سب کہہ کر مجھے ٹینشن دو۔۔۔ تم جانتی ہو ناں کہ وہ مجھے کتنا عزیز ہے؟"، اور اس کے نرمی سے پوچھنے پر حسنہ نے متورم سرخ پڑتی آنکھوں کے ساتھ ہی اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"میں ایمان کو چھوڑنے اس کے کہنے پر نہیں گیا تھا۔ ایمان کو میں نے اپنی بہن کہا ہے۔ اور صرف کہا نہیں ہے، سمجھا بھی ہے۔ بچپن کا ساتھ ہے ہم دونوں کا۔ وہ مجھ سے نہ بھی کہتا، تب بھی میں ایمان کو اکیلا نہ چھوڑتا۔۔۔ مجھے وقت دو۔ اللہ سے دعا کرو۔ اللہ ہے شفاء دینے والا۔ تمہارے رضا کو برا بھلا کہنے سے میں اپنے پیروں پہ کھڑا تو نہیں ہو جاؤں گا ناں؟"، اور یہاں حسنہ کا ضبط ٹوٹا تھا۔ وہ یکدم ہی اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑواتی، چہرہ ہاتھوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔۔۔ وہ کیسے سب اتنی جلدی پراسیس کر پاتی؟ اسکی زندگی برباد ہو کر رہ گئی تھی۔

روحان کی آنکھوں میں بھی ڈھیر ساری نمی آ جمع ہوئی تھی۔ وہ لاکھ خود کو سمجھانے کی کوشش

کرتا، مگر پھر بھی یہ کیسے سمجھا پاتا کہ وہ اب معذور ہو گیا ہے۔ وہ اب پہلے کی طرح اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ یہ خیال ہی روح کو زخمی کر دیتا تھا۔ دل کا کیا حال ہو گا! صرف خدا ہی جانے!

ایک گہرا سانس لے کر اس نے نم آنکھیں اٹھا کر حسنہ کو دیکھا تھا۔ اس کا متورم بھیگا ہوا چہرہ اس کے دل کو تکلیف دیتا تھا۔۔۔ مگر ابھی جو تکلیف اس کے اپنے حصّے کی تھی، وہ زیادہ بڑی تھی۔ وہ زیادہ اذیت ناک تھی۔ وہ موت کی حد تک سفاک تھی۔

"تم رضا سے کچھ مت کہنا، حسنہ۔ جب خود کو سنبھال لوں گا تو مختصر لفظوں میں خود ہی اس سے بات کر لوں گا میں۔"، نم آواز میں اس نے دھیرے سے کہا تو حسنہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"وہ۔۔۔"، روحان اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑھے وہ شدید اذیت میں لگتا تھا۔ "وہ میں نے۔۔۔"، حسنہ سے بولا ہی نہیں گیا۔ اور روحان یامین اس کی ان کہی بات بھی سمجھ گیا تھا۔

"تم نے رضا سے کچھ کہا ہے، حسنہ؟"، روحان کی مدھم نم سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو حسنہ کے گلے میں گلٹی ڈوب کر ابھری۔ اس کی آنکھیں مزید ڈبڈبا گئیں۔ چہرہ سرخ پڑ کر دہکنے لگا۔ ہاتھ پل بھر کو کپکپائے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے سر ہلکا سا اثبات میں ہلایا تو ایک گہرا سانس فضا کے سپرد کر کے روحان نے آنکھیں ضبط سے بند کیں۔۔۔ اللہ!

"حسنہ۔"، وہ جیسے بہت بے بسی سے بولا تھا۔ آنکھوں کی نمی بڑھ گئی تھی۔ گلا دکھنے لگا تھا۔

☆☆☆

حیدر آباد میں موجود زاویار احمد صاحب کے گھر میں سناٹے نے اپنے پنجے گاڑھ لیے تھے۔ وہ گھر جس میں کبھی کھلکھلاہٹوں کی گونج اور قہقہوں کے گیت رس گھولتے تھے، اب وہاں محض ایک خاموشی چھائی تھی۔ دو دن سے اس گھر کے مکینوں میں سے کسی نے ایک دوسرے سے نظریں نہیں ملائی تھیں۔ نظریں ملائی ہی نہیں گئی تھیں۔ کون کس سے کیا کہتا اور کیسے کہتا؟

اندھیرے نے اپنے پنجے گاڑھے ہوئے تھے۔ فجر طلوع ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ وہ

اپنے کمرے میں بیٹھی اس وقت بالکل خاموش لگتی تھی۔ سر بیڈ کراؤن سے ٹکا رکھا تھا اور آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر ساکت تھیں۔ زندگی ایک اندھیر نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہی جھٹکے سے کئی زندگیاں اندھیرے میں دھکیل دی گئی تھیں۔ مگر پرواہ کسے تھی؟

ہوتے ہیں ناں کچھ جھٹکے ایسے کہ جو کسی ایک کو نہیں، سب کو لے کر ڈوبتے ہیں۔ ایسے ہی بعض اوقات کسی ایک انسان کی کوئی ایک غلطی کئی لوگوں کی ہنسی چھین لیتی ہے۔ ان سب کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ تن تنہا کمرے میں بیٹھی تھی۔ آنکھیں ویران دکھتی تھیں۔ چہرہ سرخ پڑ رہا تھا جبکہ آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے تھے۔ وہ دو دن سے صحیح سے نہیں سوئی تھی۔۔۔ مگر اسے اپنی نیند کی فکر تھی کہاں؟

www.novelsclubb.com

بس رہ رہ کر ذہن میں ایک ہی خیال آ رہا تھا کہ اس سب میں کہیں ناں کہیں وہ بھی قصوروار ہے۔ کہیں ناں کہیں غلطی اس کی بھی ہے۔ لاپرواہی اس کی بھی ہے۔ اور یہ احساس ہی کہ وہ اپنی بہن اور ماں کے لیے کچھ نہ کر پائی بہت تکلیف دہ تھا۔ بہت بہت زیادہ!

ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ وہ ایمان سے صرف گیارہ مہینے تو چھوٹی تھی۔ سولہ سال کی لڑکی میں

آخر کتنی ہی ہمّت اور کتنا ہی حوصلہ ہو سکتا ہے؟اسے نجانے پھر بھی کیوں ایک پچھتاوا سا ہو رہا تھا۔حالانکہ نہ ہی ایمان نے اور نہ ہی رضیہ نے اسے کچھ کہا تھا۔

جبھی دروازہ کھٹکھٹایا گیا تھا۔۔۔اس نے نظریں پھیر کر بس ایک نظر دروازے کو دیکھا تھا، پھر دوبارہ سے نظریں اسی نقطے پر جمالی تھیں۔

"فاطمہ۔۔۔بیٹے کھانا کھالو۔"،دروازے کے اس پار سے زاویار صاحب کی ٹھہری ہوئی آواز گونجی تو اس نے بغیر نظروں کا زاویہ بدلے سپاٹ سے انداز میں جواب دیا۔

"بھوک نہیں ہے مجھے۔"

چند پلوں کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔پھر دوبارہ سے زاویار صاحب کی آواز گونجی تھی۔

"مجھے تکلیف مت دو،بیٹا۔"،وہ جیسے بہت ٹوٹے ہوئے لہجے میں اذیت سے بولے تھے۔فاطمہ کی ویران آنکھوں میں نمی سی ابھری تھی۔ایک گہرا نم سانس خارج کر کے اس نے نگاہیں پھر سے دروازے کی جانب اٹھائی تھیں۔کون کہہ سکتا تھا کہ وہ انسان ایک باپ ہے۔ایک بیٹی کی

زندگی کی ہی فکر نہیں، اور دوسری نے کھانا نہیں کھایا تو انہیں تکلیف ہو رہی ہے۔اس نے سر جھٹکا تھا، پھر ذرا بلند آواز میں بولی تھی۔

"مجھے بھی بہت تکلیف ہو رہی ہے۔میری بہن کو بھی بہت تکلیف ہو رہی ہے۔میری ماں کو بھی بہت تکلیف ہو رہی ہے۔اور تو کسی کی فکر نہیں ہے آپ کو۔میری فکر کیوں کر رہے ہیں؟"، اس کے لہجے میں ایک کاٹ سی تھی جو زاویار صاحب کو اپنے دل پر چلتی محسوس ہوئی تھی۔ان کے ٹرے تھامے ہاتھ لمحے بھر کو کپکپائے تھے۔آنکھوں کی نمی بڑھ گئی تھی۔

"اپنے باپ کو سزا مت دو، فاطمہ۔باپ اپنی اولاد سے بہت محبت کرتے ہیں۔اولاد کی بے رخی وہ برداشت نہیں کر پاتے۔ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔"، ان کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکتا ان کے رخسار پر بہہ گیا تھا۔وہ اب بھی کہہ رہے تھے۔"میں مر جاؤں گا، فاطمہ۔اس اذیت سے مر جاؤں گا میں۔"

"میں بھی تو مر رہی ہوں ناں۔امّاں بھی تو مر رہی ہیں ناں۔ایمان بھی تو سسک سسک کر مر رہی ہے۔۔۔اچھا ہے، سارے ساتھ ہی مر جائیں گے۔"، ان کی یہ اولاد انہیں جتنی عزیز تھی،

اتنی ہی وہ بے رحم تھی۔ وہ اپنے باپ پر ذرا ترس نہیں کھاتی تھی۔ ذرّے برابر بھی نہیں!

"آپ جائیں، ابّا۔ آپ کو دیکھتی ہوں تو اپنی بہن کے ساتھ ہوئی زیادتیاں یاد آجاتی ہیں۔"، اس کی آنکھوں کی نمی پانی بن کر گالوں پر لڑھکتی چلی گئی تھی۔ جسم کا پور پور سلگ رہا تھا۔ حلق بری طرح دکھنے لگا تھا۔

"میں بھی تو ایمان کی وجہ سے سر اٹھا کر باہر نہیں نکل سکتا۔ جس کو دیکھو یہی کہتا ہے کہ دیکھو، زاویار صاحب کی بیٹی شادی کے روز گھر سے بھاگ گئی۔ میں بھی تو کیا کچھ برداشت کر رہا ہوں، فاطمہ۔ میرا خیال کسی کو نہیں؟"، انہوں نے بھی کچھ بلند آواز میں کہا تو اندر وہ جیسے استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔

www.novelsclubb.com

"برداشت؟ برداشت کر رہے ہیں آپ؟ نہیں ابّا، نہیں۔ آپ برداشت نہیں کر رہے۔ آپ اپنے کیے کا پھل چکھ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ ایمان آپ کی وجہ سے گھر چھوڑ کر گئی ہے۔ وہ آپ کی وجہ سے آج در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ مگر آپ؟ آپ کو آج بھی عیب اس میں نظر آرہے ہیں۔ آپ کو غلطی آج بھی اسی کی نظر آرہی ہے۔ ایسے انسان کو

میں کیا کہوں؟"

زاویار صاحب نے اس کے کمرے کے بند دروازے کو ایک نظر دیکھا تھا۔آنسو ان کی آنکھ سے بہتا چلا گیا تھا۔

"میں نے بھی کھانا نہیں کھایا، فاطمہ۔"

اور اب کے دروازے کے اس پار سے فاطمہ کا قہقہہ گونجا تھا۔

"سب کا خون پی کر آپ کا پیٹ نہیں بھرا؟ سب کے کلیجے کھا کر آپ کی بھوک نہیں مٹی؟ سب کی خوشیاں نگل کر آپ مطمئن نہیں ہوئے؟"، کتنی تلخ تھی وہ۔ کتنی تلخ باتیں کرتی تھی۔زاویار صاحب کو آج اندازہ ہوا تھا۔ان کے دل کو بہت تکلیف پہنچی تھی اس کے ان الفاظ سے۔

"اتنا برا لگتا ہوں میں تمہیں؟"، انہوں نے شدید دکھ سے پوچھا تھا۔آواز مدھم ہو گئی تھی۔چہرہ جھکا لیا تھا۔ٹرے میں پڑا کھانا اب ٹھنڈا ہو گیا تھا۔اس کی تازگی ہوا میں مل کر ختم ہو گئی تھی۔وہ یخ سا کھانا بالکل عجیب سا ہو گیا تھا۔

"برے نہیں لگتے۔ظالم لگتے ہیں۔"، اور انہوں نے سرخ پڑتی آنکھوں کے ساتھ قدم موڑ

لیے تھے۔ پیچھے فاطمہ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی سسکی کو روکا تھا۔ اتنے دل برداشتہ ہو گئے تھے وہ اس کی چند باتوں سے۔ مگر سوچتے اب بھی نہیں تھے کہ ان کی اس قدر تلخ باتیں ان کی اپنی ہی اولاد نے کیسے برداشت کی ہوں گی زندگی کے سترہ سال۔ دوسروں کو الزام دینے اور ان کے نقص گننے میں ہم آگے آگے رہتے ہیں۔ بات اپنے اوپر آئے تو ہم سے معصوم اور سیدھا سادہ تو کوئی نہیں؟

☆☆☆

فجر کا وقت طلوع ہوا تو وہ کمرے میں نماز پڑھنے کے بعد یونہی کھڑکی سے باہر نظر آتے گہرے نیلے جامنی سے آسمان کو دیکھے گئی۔ اس پہر وہ کیا کر رہا ہو گا؟ کیا جاگا ہوا ہو گا؟ یا سو رہا ہو گا؟ نجانے کیا وقت ہو رہا ہو گا اس وقت وہاں؟ پتا نہیں وہ اسے یاد کرتا بھی ہو گا کہ نہیں؟ یا کیا پتا کہ اب تک تو اس نے موو آن کرنے کا ارادہ کر لیا ہو؟ اسے وہاں کی کوئی انگریز لڑکی بھی پسند آ گئی ہو۔۔۔

اور پیچھے شکست خوردہ کون رہ گئی؟ ایمان زاویار۔ بالکل اکیلی۔ بالکل تنہا۔

ایسے کیوں ہوتے ہیں لڑکے ؟ کیوں ان کی محبت اتنی کمزور ہوتی ہے کہ پل بھر میں راستہ بدل لیتے ہیں ؟ کیوں ان کے جذبات اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ وہ ایک سیکنڈ میں موو آن کر لیتے ہیں ؟ کیوں ایک لڑکی سے محبت کرنے کے بعد ان کے دل میں اور لڑکیوں کے لیے بھی گنجائش ہوتی ہے ؟ کیوں محبت کو بھلا دینا کچھ لوگوں کے لیے اتنا آسان ہوتا ہے ؟

اس کی آنکھوں سے آنسو تواتر کے ساتھ بہتے جائے نماز میں جذب ہوتے جا رہے تھے۔ یونہی اس پل اس کا شدّت سے دل چاہا تھا ارتضی مراد کو دیکھنے کا۔ محبت اتنی تکلیف کیوں دیتی ہے ؟ کیوں محبت کرنے والے کبھی مل نہیں پاتے ؟ کیوں اگر مل بھی جائیں تو قسمت انہیں جدا کر دیتی ہے ؟

www.novelsclubb.com

سب سے زیادہ آزمائشیں محبت ہی دیتی ہے شاید !

اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ فضا میں بلند کیے تھے۔ دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو اس نے خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا۔ آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اللہ سے دعا مانگے۔ اس نے دعا مانگنا اس

دن سے چھوڑ دی تھی جس دن اس کا رشتہ عامر سے طے ہوا تھا۔تب سے سب بے معنی لگنے لگا تھا۔سب خوشیاں،سب خواہشات مٹی کے دھوئیں کی مانند ریت ریت ہو گئی تھیں۔کوئی جوش،کوئی جذبہ بچا ہی نہ تھا۔۔۔مگر پھر بھی آج اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اللہ سے کچھ مانگے۔

اور آج اس نے پوری شدّت سے پہلی بار اللہ سے ارتضی مراد کو مانگا تھا۔گرم گرم آنسو اس کی خالی ہتھیلیوں پر گرتے جا رہے تھے۔وہ روتے روتے،سسکتے سسکتے،ہچکولے کھاتے وجود کے ساتھ صرف ایک شخص کو مانگ رہی تھی۔

"ارتضی مراد کو میرا کر دے،یارب۔میرے نصیب میں اسے اور اس کے نصیب میں مجھے لکھ دے،یارب۔تو تو سب کر سکتا ہے ناں؟تو تو لکھی قسمت کو بدلنے پر بھی قادر ہے۔تو پھر تو میری قسمت میں،میرے مقدر میں ارتضی کو لکھ دے۔اس کے دل میں اور اس کی زندگی میں میرا سب سے بڑا حصّہ لکھ دے۔مجھے اس کا ہمسفر لکھ دے۔راہ گزر زیست میں میرا ہم راہی اسے کر دے۔ہماری منزل ایک کر دے۔"،وہ کہتی جا رہی تھی اور آنسو گرتے جا رہے تھے۔کمرے کے در و دیوار اپنے اس نئے مہمان کو ترحم سے دیکھ رہے تھے۔کتنی تکلیف دیتی ہے ناں

یہ محبت! کیوں دیتی ہے اتنی اذیت؟ کیوں دیتی ہے اتنی تڑپ؟

کسی عقلمند انسان نے کہا ہے کہ محبت کے دعوے دار کو پھر نیند سکون کی نہیں آیا کرتی۔اب سے اس کی بے چین راتوں کا بھی آغاز ہوا چاہتا تھا۔وہ سب چھوڑ تو آئی تھی، مگر جس کے لیے سب چھوڑنا چاہتی تھی، وہ تو اسے چھوڑے پردیس میں بیٹھا تھا۔اس کے گھر چھوڑ دینے کا اب اسے کوئی فائدہ نہ تھا، مگر وہاں رہ کر بھی تو کوئی فائدہ نہ تھا ناں۔بہتر یہ نہیں کہ دونوں غیر مفید اشیاء میں سے وہ چن لی جائے جس سے دل میں لگی آگ کچھ ٹھنڈی پڑ جائے؟اس نے بھی اسی آپشن کا انتخاب کر لیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ خاموش سی سوئمنگ پول کے پاس بیٹھی تھی۔شانوں پہ کپڑوں کا ہم رنگ دوپٹہ پھیلائے، بالوں کا گول مول کر کے ڈھیلا سا جوڑا بنائے، وہ سر جھکائے خاموشی سے کرسی کے ہتھے پہ انگلی پھیر رہی تھی۔اس کا انداز ویرانی لیے ہوئے تھا۔دور افق پر اب اچھی خاصی روشنی پھیل گئی تھی۔فجر بیتے کافی منٹ گزر گئے تھے۔پرندوں کی چہچہاہٹ کا مدھر گیت اس کے کانوں میں اترتا جا رہا تھا۔مگر اسے کسی شے میں کوئی دلچسپی نہیں ہو رہی تھی۔

رمیص جہانزیب کا گھر اچھا تھا، مگر اسے اچھا نہیں لگا تھا۔اس گھر میں اس کے گھٹے دل کو مزید گھٹن محسوس ہوتی تھی۔اس گھر کے در و دیوار میں محض ایک ہی آدمی کے نام کی گونج تھی۔۔۔ اور وہ آدمی "رمیص جہانزیب" ہی تھا۔وہ ارحم کو دیکھتی تو اسے وہ رمیص کی پرچھائی لگتا۔غزل کو دیکھتی تو وہ اسے رمیص کے غم میں آدھی ہوئی لگتی۔اس گھر میں جابجا رمیص کی کامیابیوں کے سرٹیفیکیٹ دیوار پر لگے تھے۔وہ ان سرٹیفیکیٹوں کو دیکھتی تو سوچنے لگتی کہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن وہ یوں رمیص جہانزیب کے گھر میں رہے گی۔۔۔

وہ سوچوں میں مکمل کھوئی ہوئی تھی جب یکدم ہی کسی نے اس کو شانے سے ہلایا تھا۔کرنٹ کھا کر وہ سیدھی ہوئی تو اپنے بالکل سامنے، خود پر جھکی ہوئی غزل سے آنکھیں ٹکرائیں۔اس کی آنکھوں میں وہی نرمی تھی جو پچھلے چند دن سے وہ دیکھ رہی تھی۔اب تو اس کی اس نرمی کی بھی عادت ہونے لگی تھی۔ارتضی مراد کے بعد اگر کسی کی نرمی اسے بے حد اچھی لگی تھی تو وہ غزل رمیص کی ہی تھی۔

وہ ہلکا سا مسکراتی ہوئی اس کے عین سامنے رکھی کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔نگاہیں

اس کے چہرے پر جمائیں۔ایمان کی سیاہ آنکھیں اس کے رونے کی چغلی کھا رہی تھیں، مگر وہ خاموش رہی۔۔۔چند پل خاموشی سے سرک گئے۔ جبھی ایمان کو اس کی آواز سنائی دی۔

"میرا گھر کیسا لگا تمہیں؟"،وہ اسی نرمی سے پوچھ رہی تھی۔اس کی ہیزل رنگ آنکھوں میں بھی ایک نرم سا تاثر تھا۔۔۔اور یہ تاثر اسے کسی کی یاد دلاتا تھا۔۔۔کسی بہت اپنے شخص کی۔اس نے بے اختیار ہی نظریں چرائی تھیں۔

"شاندار۔"،اس کا یک لفظی جواب سن کر غزل سر جھٹک کر ہنس دی تھی۔پھر سر نفی میں ہلاتی اسے دیکھتی بولنے لگی تھی۔

"گھر کی بات کر رہی ہوں۔مکان کی نہیں۔"،اس کا لہجہ سادہ سا تھا،یوں جیسے لوگوں کے ذہن پڑھنا اس کا معمول کا کام ہو۔وہ اس کا ذہن بھی پڑھ چکی تھی، جبھی سوال ہی ایسا کیا تھا۔ایمان نے اسے سادگی سے دیکھ کر شانے اچکائے تھے۔

"خاموش۔"،اور اب کے غزل نے کچھ پل ٹھہرنے کے بعد دھیرے سے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔وہ اس سے اتفاق رکھتی تھی۔

www.novelsclubb.com

"شاید صحیح کہہ رہی ہو تم۔ میرے گھر کی رونق رمیص کے دم سے تھی۔ وہ نہیں رہا تو نہ میرا بات کرنے کا دل چاہتا ہے، نہ خاموشی ختم کرنے کا۔"، اس نے بات مکمل کر کے ایمان کو دیکھا تھا جو خاموش نظروں کو اس پر جمائے ہوئے تھی۔ مگر ان خاموش نظروں میں ایک سوال سا پنپ رہا تھا۔ ایک تجسس سا کچھ جاننے کا!

"کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟"، غزل نے نرمی سے اس سے کہا تو اس نے فوراً سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"کیا کسی ایک انسان کے جانے سے کسی کی خوشی اور مسکراہٹ چھن سکتی ہے؟"، پس منظر میں پرندے اب بھی مدھر نغمے گا کر فضا کو معطر کر رہے تھے۔ وہ دونوں یک ٹک ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ غزل نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"ہاں، جب جانے والا شخص کسی کی کل متاع ہو، تو وہ جاتے جاتے اس کی مسکراہٹ اور خوشی چھین جاتا ہے۔"، ذہن کے پردے پر کسی اپنے کا ہنستا مسکراتا چہرہ لہرایا تھا۔ دل میں تکلیف نے سر اٹھایا تھا۔

"کیا کسی ایک شخص کے جانے سے انسان خاموش ہو سکتا ہے؟"، ایک اور سوال، ایک اور

استفسار۔ غزل نے ایک بار پھر سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"ہاں، اگر وہ ایک شخص انسان کو ہر شے سے بڑھ کر ہو تو وہ جاتے ہوئے اس کو خاموشی بھی تھما جاتا ہے۔ تنہائی اور اکیلے پن کی خاموشی۔"، چمکتی ہوئی سنہری آنکھیں آنکھوں کے سامنے لہرائیں تو اس کی آنکھیں نم پڑنے لگیں۔ گلے میں گلٹی ڈوب کر ابھری تھی۔

"کیا کوئی ایک شخص اتنا اختیار رکھتا ہے کہ جاتے جاتے کسی کی زندگی کی کل رونق ساتھ لے جائے؟"، ایمان زاویار کی آنکھوں کے سامنے دو مسکراتی ہوئی شہد رنگ آنکھیں گردش کرنے لگی تھیں۔ نمی نینوں میں دھیرے دھیرے اترنے لگی تھی۔

"ہاں، جب جانے والا شخص ہماری زندگی کی کل رونق ہو تو اس کے جاتے ہی رونق بھی ختم ہوتی محسوس ہوتی ہے۔"، دونوں کا درد اور غم ناقابل بیان تھا۔ فجر باسی ہو چکی تھی مگر فضا میں اب بھی وہی سحر کی تازگی چھائی تھی۔ غزل نے نم پڑتی آنکھیں جھکا کر ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں پونچھی تھیں۔ پھر چہرہ اٹھا کر ایک بار پھر ایمان کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کی نمی واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔

www.novelsclubb.com

"جانتی ہو ایمان؟ رمیص کہا کرتا تھا کہ زندگی بہت ظالم ہوتی ہے۔ موت سے بھی زیادہ!"، اس کی بات ابھی مکمل بھی نہ ہو پائی تھی کہ ایمان نے بات کاٹ کر کھوئے کھوئے سے انداز میں یکدم ہی کہا تھا۔

"صحیح کہتے تھے۔"

غزل نے ٹھہر کر اسے دیکھتے سر نفی میں ہلایا تھا۔ اس کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔

"لوگ کہتے ہیں کہ زندگی موت سے زیادہ ظالم ہوتی ہے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ زندگی سے بھی زیادہ ظالم وہ حالت ہوتی ہے جب انسان موت زندگی کے بیچ پھنسا ہو۔ جب وہ اندر سے مر گیا ہو مگر جسم اب بھی زندہ ہو۔ جب کوئی جان سے پیارا موت کے گھاٹ اتر جائے اور آپ زندہ رہو۔ جب سب کچھ ختم ہو جائے سوائے ہمارے۔ ایسے جیسے دنیا کی ہر شے فنا ہو جائے اور آپ اکیلے رہ جاؤ۔ تنہائی آپ کو سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دے۔ وقت آپ کو اکیلا کر دے۔ آپ سے آپ کی سانسیں چھین کر آپ کو زندہ رہنے پر مجبور کر دے۔۔۔ یہ وقت اور یہ حالت زندگی سے زیادہ ظالم ہوتی ہے۔"، وہ کہتی جا رہی تھی اور اذیت ہر ادا ہوتے لفظ کے ساتھ ساتھ

بڑھتی جارہی تھی۔ایمان کی آنکھ کی نمی بہنے کو بے تاب تھی۔غزل کی آنکھوں کا گلابی پن بڑھ گیا تھا۔

"مگر جانتی ہو،ایمان؟ایسے وقت میں بھی انسان کو زندہ رہنا پڑتا ہے۔اپنے لیے نہیں تو اپنے سے جڑے رشتوں کے لیے۔انسانوں کے لیے نہیں تو اس وعدے کے لیے جو ہمارے اللہ نے ہم سے لیا تھا۔"،اور یہاں ایمان نے بے اختیار ہی اس سے پوچھا تھا۔

"کیسا وعدہ؟"،غزل گلابی پڑتی آنکھوں کے ساتھ ہلکا سا مسکرائی تھی۔

"اس امانت،جان،میں خیانت نہ کرنے کا وعدہ۔"،اور اس وقت یکدم ہی ایمان نے کن اکھیوں سے سوئمنگ پول کو دیکھا تھا۔وہ گہرا تھا،اچھا خاصا گہرا!اس کا پانی یخ ٹھنڈا تھا۔بے ساختہ ہی اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔کیا غزل رمیص ایک بار پھر اس کے ارادے بھانپ گئی تھی؟

"اللہ نے انسان کو جان دی تو ہے مگر امانت کے طور پر۔اس کی حفاظت جہاں تک ہو سکے،وہاں تک کرنا ہمارا فرض ہے۔ہم سے اس بارے میں بھی سوال کیا جائے گا۔"،وہ اب نرمی سے اسے

سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ایمان کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر رخسار پر نیچے ہی نیچے لڑھکتا چلا گیا تھا۔"زندگی بہت سنگدل ہے،ایمان۔یہ انسان کو وہ وہ وقت دکھاتی ہے جسے دیکھنے کا انسان کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔اسے ان ان راستوں پر سے گزرنے پر مجبور کرتی ہے جن پر چلتے ہوئے انسان کے قدم لہولہان ہو جاتے ہیں۔زندگی اسے رلاتی ہے۔اسے تڑپاتی ہے۔مگر اس سب کے باوجود ہمیں یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ ہم اس زندگی کو ختم کر ڈالیں۔جانتی ہو؟اگر زندگی ختم کرنے کا اختیار انسان کو دے دیا جاتا تو آج کوئی بھی انسان زندہ نہ بچتا۔دنیا اس وقت بنجر میدان کے سوا کچھ نہ ہوتی۔"،وہ کہہ کر خاموش ہوئی تو ایمان نے اپنے آنسوؤں سے بھیگے چہرے کو ہتھیلیوں سے پونچھا۔اس کا اگلا سوال بھی تیار تھا۔

"اگر ایسا ہے تو کیوں اللہ تعالی اپنے بندوں کو موت کے دہانے تک پہنچا دیتا ہے؟اسے اس قدر بے بس کر دیتا ہے کہ موت ہی اسے اپنی اذیت کا واحد حل لگنے لگتی ہے؟کیوں اسے اس نہج پر لا کھڑا کر دیتا ہے کہ انسان کو یہ دنیا گھٹن میں مبتلا کرنے لگتی ہے؟اس پر اس کی سانسیں تنگ ہونے لگتی ہیں؟"،وہ متورم لہجے میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی تو چند پلوں تک غزل خاموش

www.novelsclubb.com

سی ہو کر اسے دیکھے گئی۔ وہ لڑکی بہت چھوٹی تھی اور زندگی اسے سبق بہت بڑے بڑے دے رہی تھی۔ اسے اس پر بے طرح ترس آیا تھا۔ زندگی واقعی بہت ظالم ہے۔ بہت، بہت زیادہ!

"ایک بات کہوں تم سے، ایمان؟"، اس کے پوچھنے پر ایمان نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

"یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ آرام کی نہیں۔ اگر انسان یہ سمجھ جائے ناں، تو کبھی کوئی انسان موت کو گلے لگانے کے بارے میں سوچے بھی نہیں۔ اذیت، تکلیف، گھٹن، یہ سب امتحان کی مختلف صورتیں ہیں۔ یہی تو اصل آزمائش ہے کہ کیسے انسان اس امتحان کو بغیر کسی شارٹ کٹ کے پار کرتا ہے۔ جو لوگ موت کو گلے لگانے کے بارے میں سوچتے ہیں، وہ شارٹ کٹ راستے پہ گامزن ہو جاتے ہیں۔۔۔ اور لوگ اکثر بھول جاتے ہیں کہ تاریک بن میں بنے شارٹ کٹس پر اکثر مصیبتیں ہی مصیبتیں ہوتی ہیں۔۔۔ شارٹ کٹس کبھی انسان کو ویسے منزل تک نہیں پہنچاتے جیسے سیدھی راہ پہنچاتی ہے۔۔۔ اب یہ فیصلہ انسان کے ہاتھ میں ہے کہ وہ سیدھی کانٹے دار راہ پر چل کر منزل تک پہنچنا چاہتا ہے یا پھر کسی گمنام شارٹ کٹ پر چلنا چاہتا ہے جس پر چلتے ہوئے منزل کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی۔"، غزل نے مختصر اور آسان لفظوں میں آج اسے بہت

بڑی بات سمجھادی تھی۔اسے اس کی زندگی کا بہت بڑا سبق، بہت بڑی نصیحت دی تھی۔اور شاید یہ سبق اس کے ساتھ ہمیشہ رہنا تھا۔۔۔کون جانے!

"انسان جب یہ بھول جائے ناں کہ اسے اس دنیا میں بھیجنے کا مقصد کیا تھا، تو اسے اس دنیا کی ہر شے بوجھ لگنے لگتی ہے۔زندگی بھاری بھر کم سا بوجھ لگتی ہے جو گھسیٹتے رہنا ہوتا ہے۔اگر انسان یہ سوچ کر دنیا میں چلے کہ یہ اس کی جنت نہیں بلکہ آزمائش ہے، تو آدھے سے زیادہ غم تو اس کے یونہی ختم ہو جائیں۔"، وہ بہت خوبصورت باتیں کرتی تھی۔بالکل رضا کی طرح! ایمان کو اس لمحے پھر سے رضا شدّت سے یاد آیا تھا۔

وہ اسے یونہی دیکھے گئی تھی۔

"آپ بہت پیاری ہیں، غزل۔"، اور اس کی اگلی بات پر یکدم ہی غزل ہنس پڑی تھی۔منہ پہ ہاتھ رکھے وہ ہنستی جا رہی تھی۔آج شاید بہت دنوں کے بعد وہ یوں کھل کر ہنسی تھی۔بغیر کسی دکھ اور فکر کے۔اور پھر ایک وقت آتا ہے جب دکھ سمٹنے لگتے ہیں۔غم بٹنے لگتے ہیں۔چہرے پھر سے کھلنے لگتے ہیں۔

www.novelsclubb.com

☆☆☆

کراچی پر شام نے اپنے پر پھیلانے شروع کیے تو سورج بھی بادلوں کی اوٹ سے نکل کر ٹھنڈی دھوپ ہر سو بکھیرنے لگا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں نے چل کر موڈ اور موسم، دونوں کو خوشگوار بنا رکھا تھا۔ایسے میں رمیص جہانزیب کے گھر کے باہر ایک گاڑی آ رکی تھی۔اور پھر اگلے ہی پل گاڑی سے سوٹڈ بوٹڈ سے عالم صاحب نکلے تھے۔گاڑی لاک کر کے وہ گھر کی جانب بڑھے تھے۔

چند پلوں بعد دیکھا جاتا تو وہ گھر میں داخل ہوتے نظر آتے۔ہاتھ میں سیاہ بریف کیس تھام رکھا تھا۔چہرے پر سنجیدگی کی لکیریں چھائی تھیں۔ان سے کچھ قدم پیچھے ہی ثمرین بھی چلتی ہوئی آ رہی تھی۔وہ انہیں لیے ڈرائنگ روم تک پہنچی تو یکدم ہی جیسے رک سی گئی۔ڈرائنگ روم میں ان کے عین سامنے، ان کی جانب پشت کیے، ایمان کھڑی تھی۔سبز رنگ کے شلوار قمیض کے ساتھ ہم رنگ دوپٹہ سر پر اوڑھے، وہ ٹھوڑی ذرا سی اٹھائے سامنے دیوار پر لگی فیملی فوٹوز دیکھ رہی تھی۔

عالم صاحب نے کچھ حیرت سے چہرہ موڑ کر ثمرین کو دیکھا تھا، جو ہلکا سا جھینپ کر مسکرائی تھی

اور پھر پیچھے سے کھڑے کھڑے ہی گلا کھنکارا تھا۔ایمان فوراہی پیچھے مڑی تھی۔سامنے ثمرین کے ساتھ کھڑے صاحب کو دیکھ کر اس نے سوالیہ نظروں سے ثمرین کو دیکھا تھا۔

"یہ عالم صاحب ہیں۔رمیص صاحب کے وکیل۔"، ثمرین نے بتایااور چند قدم آگے آکر عالم صاحب کے سامنے کھڑی ہو کر ان سے پھر سے کہنے لگی۔اشارہ ایمان کی جانب تھا۔"یہ ایمان ہیں۔غزل باجی کی دوست۔"

عالم صاحب نے سمجھ کر سر ہلایا تھا۔

"السلام علیکم۔"،ایمان ان کو سلام کرتی ہوئی چل کر ثمرین تک پہنچی تھی۔جبھی ثمرین اس کی جانب مڑی تھی۔

www.novelsclubb.com

"ایمان،آپ جا کر باجی کو بلا لائیں گی؟تب تک میں ذرا کھانے پینے کا انتظام دیکھ لوں۔"، ثمرین کے کہنے پر وہ سر ہلاتی ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی تھی۔پیچھے عالم صاحب نے بریف کیس کھول کر فائلز اور دستاویزات نکالنا شروع کر دیئے تھے۔ان کے چہرے کی سنجیدگی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔انداز بھی بے لچک سا تھا۔

کچھ ہی لمحوں بعد سیاہ نقاب لگائے غزل کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ایمان بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی تھی۔اس نے اب کے صحیح سے چہرے کے گرد دوپٹہ باندھ لیا تھا۔غزل آکر عالم صاحب کے عین سامنے صوفے پر بیٹھ گئی تو عالم صاحب نے نگاہیں پھیر کر ایمان کو دیکھا،اور پھر اسے۔

"میم۔۔۔کیس ریڈی ہے۔چند دنوں میں فائل ہو جائے گا۔آپ تمام ڈاکومینٹس دیکھ لیں۔"، کہتے ہوئے انہوں نے درمیان میں رکھی میز پر چند صفحات رکھے اور پھر صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے پیچھے ہو بیٹھے۔غزل نے سنجیدگی سے وہ صفحات اٹھا کر نظروں کے سامنے کیے تھے۔ آنکھیں جوں جوں صفحات پر آگے بڑھتی جا رہی تھیں،نم پڑتی جا رہی تھیں۔ایمان خاموش سی غزل کے برابر میں بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔عالم صاحب کی سنجیدہ مگر جانچتی نظریں ایمان پر ہی ٹکی تھیں۔

چند منٹوں بعد غزل نے سر اٹھا کر عالم صاحب کو دیکھا تھا جواب اس کے بولنے کے ہی منتظر لگتے تھے۔

www.novelsclubb.com

"فیضان صاحب کو دکھادی آپ نے یہ فائل؟"،اس کے پوچھنے پر عالم صاحب نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"ہم نے کورٹ سے پیس فل پلیڈ کی تھی کہ وہ رمیص صاحب کے کیس پر نظر ثانی کریں مگر کوئی رسپانس نہیں آیا۔۔۔یہ بات آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی کہ سامنے حکومت ہے۔اور حکومت سے پنگا کوئی نہیں لینا چاہتا۔"،وہ کہہ کر خاموش ہوئے تو غزل کی آنکھوں کی نمی بڑھی۔

"میں آپ کا کیس لڑ رہا ہوں۔ مگر اگر انہوں نے جج خرید لیا تو کوئی فیصلہ نہیں ہو سکے گا۔"،وہ اب اسے مزید ممکنات بتلا رہے تھے اور وہ خاموشی سے سر جھکائے انہیں سنتی جا رہی تھی۔ایمان بھی خاصی دلچسپی اور سنجیدگی سے ان کی ہر بات سن رہی تھی۔وہ اس کیس کے بارے میں جانتی تھی۔خبروں میں کئی دنوں سے اس کیس کے متعلق باتیں چل رہی تھیں۔۔۔تبھی سب نہیں تو کچھ ناں کچھ تو وہ جانتی ہی تھی۔

"کینیا کے اس افسر سے میری بات ہوئی تھی کل جس نے رمیص صاحب کی وفات کی خبر سب

www.novelsclubb.com

سے پہلے دی تھی۔اس کا کہنا ہے کہ انہیں ایک پرائیویٹ نمبر سے کال آئی تھی جس میں انہیں اس پتے پر آنے کا کہا گیا تھا۔۔۔اور جب وہاں وہ لوگ پہنچے تو۔۔۔"،انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔جانتے تھے کہ اگر اس سے زیادہ کہا تو تکلیف سب کو ہو گی۔ہر اس شخص کو ہو گی جو رمیص جہانزیب سے محبت کرتا تھا،اور کرتا ہے۔اور وہ بھی انہی لوگوں میں شامل تھے۔

"تو پھر کیا کریں ہم؟کیسے انصاف حاصل کریں؟"،اب کے غزل کی آواز میں نمی کے ساتھ ساتھ کپکپاہٹ بھی تھی۔ایک خوف بھی تھا۔وہ خوف حکومت کا نہیں تھا۔وہ خوف اس بات کا تھا کہ اگر وہ رمیص کو انصاف نہ دلوا سکی تو؟اگر وہ اس کا کیس ہار گئی تو؟تو پھر وہ کیا منہ دکھائے گی اسے روز قیامت؟کیا دلیل دے گی اسے اس بات کی؟اس ہار کی؟

"میرا دماغ تو خود پھنس کر رہ گیا ہے، میم۔ سمجھ ہی نہیں آرہا کہ کیا کروں۔رمیص صاحب کے قاتلوں کو ایسے چھوڑ نہیں سکتا میں اور کچھ کروں کیسے، یہ سمجھ نہیں آرہا۔"،وہ پریشانی سے کہہ رہے تھے اور غزل بھی اتنی ہی پریشانی سے انہیں سنتی جا رہی تھی۔ہر راہ بلاک نظر آرہی تھی۔جیسے ہر موڑ پر کوئی درندہ انہیں چیر پھاڑنے کے لیے پہلے سے ہی موجود ہو۔

www.novelsclubb.com

"آپ لوگ سوشل میڈیا کا استعمال بھی تو کر سکتے ہیں۔"، جبھی مضطرب سی اس خاموشی میں ایمان کی ٹھہری ہوئی آواز گونجی تو غزل نے بے اختیار ہی چہرہ اس کی جانب موڑا۔ پھر نظریں پھیر کر ایک بار پھر عالم صاحب کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ بھی ایمان کو سننے کے منتظر تھے۔ وہ مزید کہہ رہی تھی۔

"آج کا دور سوشل میڈیا کا دور ہے، غزل۔ آپ کو مسجدوں، اسکولوں، کالجوں میں اتنے لوگ نہیں ملیں گے جتنے سوشل میڈیا پر ملیں گے۔ سوشل میڈیا پاور بہت معنی رکھتی ہے۔ سوشل میڈیا اکاؤنٹس کے پیچھے چھپے ان نوجوانوں کی پاور بہت معنی رکھتی ہے۔ رمیص جہانزیب کے کیس کی ہر ایک ڈیٹیل سوشل میڈیا پر ڈالنا شروع کر دیں۔۔۔ لوگ سکھ کا سانس نہیں لینے دیں گے اس سو کالڈ گورنمنٹ کو۔"، اس کی بات مکمل ہونے پر عالم صاحب نے افسردگی سے سر نفی میں ہلایا تھا۔ ان کے چہرے پر مایوسی صاف نظر آتی تھی۔

"یہ نوجوان بہت پاور رکھتے ہیں مگر یہ اپنی اس پاور سے بے خبر ہیں، بیٹے۔ یہ نہیں جانتے کہ یہ حکومت پلٹنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ کاسہ پلٹنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ یہ اس بات سے بے خبر ہیں

کہ ان کے بازوؤں میں تخت الٹنے کی طاقت ہے۔یہ کسی بات پر بولتے ہیں تو چند دن بول کر خاموش ہو جاتے ہیں۔یہ سو کالڈ حکومت جانتی ہے کہ اس عوام کے نوجوانوں میں ہمّت تو ہے، مگر کنسسٹینسی نہیں۔"،وہ بولتے بولتے لہجہ مدھم کر گئے تھے، جیسے انہیں اس بات کا بہت افسوس ہو۔

"حکومت جانتی ہے کہ نوجوان بولیں گے تو سہی، مگر پھر بول بول کر تھک جائیں گے اور ایک وقت آئے گا کہ چپ کر جائیں گے۔جب بھی حکومت پر کوئی بات آتی ہے تو حکومت اس مسئلے کو زیادہ سے زیادہ ڈریگ کرتی ہے۔۔۔نوجوانوں کو تھکاتی ہے۔انہیں اس وقت تک لے آتی ہے جب وہ چپ کر جاتے ہیں۔تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔۔۔ہماری نوجوان نسل میں ہمّت اور جذبہ تو ہے، مگر ثابت قدمی نہیں۔اور ہماری یہ حکومت اسی بات کو نوجوانوں کے خلاف استعمال کرتی ہے۔"،وہ چپ ہوئے تو سارے میں ایک سکینت سی چھا گئی۔ایمان جانتی تھی کہ وہ صحیح کہہ رہے ہیں۔ان کا کہا ایک ایک حرف سچا ہے۔ایک ایک بات حقیقت ہے۔

"تو پھر؟ پھر کیا کریں گے ہم؟"،غزل نے کانپتی آواز میں پوچھا تو عالم صاحب خاموش ہو کر

پر سوچ انداز میں آنکھیں سکیڑے میز پر پڑے کاغذات کو دیکھنے لگے۔ان کا انداز بتلاتا تھا کہ دماغ میں کچھ چل رہا ہے۔ایمان بھی منتظر سی انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔

"پھر ایک کام ہے جو ہم کر سکتے ہیں۔۔۔ثبوت۔ثبوت اکٹھے کرنے ہوں گے ہمیں۔بذات خود ہمیں ہر شے اسکین کر کے ثبوت اکٹھے کرنے ہوں گے۔اور وہ ثبوت قاتل کے خلاف نہیں، حکومت کے اس کیس میں ملوث ہونے کے چاہئے ہوں گے۔کوئی ٹھوس ثبوت جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ رمیص جہانزیب کے ساتھ ہوئے ہر ظلم کے پیچھے یہ حکومت ہے۔"، وہ بول کر خاموش ہوئے تو ڈرائنگ روم میں ایک جان لیوا سی خاموشی چھا گئی۔ایک سکوت سا تھا جو ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لیتا محسوس ہو رہا تھا۔

"مگر اگر ٹارگٹ کو اچیو کرنا ہے تو سوشل میڈیا اور یوتھ پاور ہمیں درکار ہو گی۔"،اب کے ایمان نے پھر سے کہا تو عالم صاحب مسکرائے۔ان کی مسکراہٹ میں بھی تلخی اور اذیت پنہاں تھی۔

"جو عوام اپنے لاڈلے وزیر اعظم کے لیے کچھ نہ کر سکی، آپ کو لگتا ہے کہ وہ رمیص کے لیے کچھ کر سکے گی؟ سلیمان خان بے گناہ جیل میں قید ہے مگر یہ عوام کیا کر رہی ہے؟ خاموشی سے

تماشہ دیکھ رہی ہے۔۔۔کچھ بھی نہیں کر رہی۔اس عوام سے امید لگانا بے کار ہے، بیٹے۔"، وہ بول کر خاموش ہوئے تو ایمان نے ایک گہرا سانس لیا۔ان کی ایک ایک بات بالکل درست تھی۔وہ کیسے ان کی کسی بات سے اختلاف کرتی؟ کرتی بھی تو کس بنا پر؟

"مگر ہم تو امید عوام سے نہیں، اللہ سے لگا رہے ہیں ناں، عالم صاحب؟"، جبھی خاموش پڑے کمرے میں غزل کی سنجیدہ سی آواز گونجی تو ان دونوں نے ہی بے اختیار اسے دیکھا تھا۔اس سب میں وہ اس ہستی کو تو بھول ہی بیٹھے تھے جو ہر شے کی مالک تھی۔جس کے دست قدرت میں ہر شے، ہر کام تھا۔وہ اب سر اٹھائے کہہ رہی تھی۔

"میں نے اس کیس میں قدم صرف اللہ کا نام لے کر رکھا تھا، عالم صاحب۔اور مجھے ساری امید اسی سے ہے۔کیس ہو گا اور انشاءاللہ ہم یہ کیس جیتیں گے بھی۔کیسے جیتیں گے، یہ اللہ جانتا ہے۔راستے بنانے والا اللہ ہے، وہی راستے بنائے گا۔"، اسے وہ لمحہ یاد آیا تھا جس پل اس نے پہلی بار تہجد میں سجدے میں سر رکھے خود سے اور رمیص سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ رمیص کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچا کر چھوڑے گی۔اس روز اس نے اللہ کے سہارے یہ قصد کیا تھا۔وہ

جانتی تھی کہ اس دنیا میں اسے کسی کا سہارا نہیں، سوائے دنیا بنانے والے کے۔اور آج بھی وہ فائنل دستخط کرنے لگی تھی، صرف اسی ایک اللہ کے سہارے جس پر اسے یقین تھا۔اسے یقین تھا کہ اللہ بہترین منصف ہے۔وہ انصاف کا ترازو تھامے ہوئے ہے۔اور اسے اللہ کے انصاف پر بھروسہ تھا،ایمان تھا کہ وہ ظالم کو فتح نہیں دے گا۔وہ مظلوم کو پسنے نہیں دے گا۔وہ عدل قائم کرے گا۔ظالموں کو ان کے انجام تک پہنچائے گا۔فیصلہ تو وہ کرے گا اور عمل مخلوق کرے گی۔

اس نے میز سے قلم اٹھا کر اپنی گود میں دھرے کاغذات کو ایک نظر دیکھا تھا۔یہ وہ فائنل پیپرز تھے جو کورٹ میں سبمٹ ہونے تھے۔اور اس نے آج بہت ہی ہلکے دل کے ساتھ تمام دستخط کر دیئے تھے۔ایمان انسان کو مضبوطی دیتا ہے۔وہ بھی خود میں مضبوطی محسوس کر رہی تھی۔

ایمان اس کے برابر میں بیٹھی اسے نجانے کیسے اور کیوں ہمّت سی بخش رہی تھی۔اس نے تمام دستخط کر کے چہرہ اٹھا کر عالم صاحب کو دیکھا تھا۔آج اسے عالم صاحب کی آنکھوں میں بھی نمی نظر آئی تھی۔وہ رمیص کے مینٹور تھی۔اس کے بچپن کے ساتھی۔۔۔اور جو بات تھی،

انہوں نے ہر ایک چیز میں اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔

کیا حقیقت ہے ناں! ایک انسان جاتے جاتے بہت سوں کی زندگی ادھوری کر جاتا ہے۔ان کی زندگی میں بھی رمیص جہانزیب کے نام کا ایک خلاء موجود تھا، جو کبھی بھی پر نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

لندن آج اسے بہت خاموش محسوس ہو رہا تھا۔اسے یہاں آئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے اور ایک کے بعد ایک جو چیزیں ہو رہی تھی، انہوں نے اس کا یہاں رہنا محال کر دیا تھا۔اس کا دماغ ان چند لوگوں کو ہی سوچ سوچ کر تھکتا جا رہا تھا جنہیں وہ اپنے پیچھے پاکستان میں چھوڑ آیا تھا۔

جبھی پردہ کھسکا کر کائی اندر داخل ہوا تھا۔اسے دیکھ کر وہ چند پلوں کے لیے ٹھہرا تھا، پھر سر جھٹکتا اس کے قریب چلا آیا تھا۔

"کھانا کھا لیا تم نے؟"، اس نے عام سے لہجے میں پوچھتے ہوئے دوسری کرسی گھسیٹی تھی اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔رضا نے سوجی آنکھیں پھیر کر اسے ایک نظر دیکھا تھا۔کائی نے اس کی یہ سوجی ہوئی آنکھیں اسی پل دیکھ لی تھیں جس پل وہ کافی شاپ میں داخل ہوا تھا، مگر پوچھنا

www.novelsclubb.com

مناسب نہ لگا سو چپ ہی اختیار کر لی۔

"نہیں۔"، رضا نے اسے دیکھتے ہوئے ہی جواب دیا تھا۔ کائی نے ایک گہرا سانس لے کر اسے افسوس سے دیکھا تھا۔

"کیا کھانا نہ کھانے سے تمہاری ٹینشن ختم ہو جائے گی؟"، اس کی آنکھوں میں باقاعدہ ایک سوال سا تھا، گویا وہ واقعی جاننا چاہتا ہو کہ ایسا ممکن ہے یا نہیں۔ رضا نے ہنوز اسی طرح اسے تکتے ہوئے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"تو پھر؟"، وہ حیران ہوا تھا۔

"پھر مجھے نہیں پتا کہ کیا کروں۔"، رضا کا انداز سپاٹ تھا۔ چہرہ بھی۔ کائی نے کرسی پوری طرح سے اس کی جانب گھمائی تھی اور اسے دیکھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"تمہارے کھانا نہ کھانے سے اگر کسی کی زندگی پہ فرق پڑے گا تو وہ صرف تم ہو گے۔ اور کسی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور میرا تو ایک ہی اصول ہے۔ پہلے خود کو رکھو، پھر کسی اور کو۔"، اس نے کہتے ہوئے آخر میں شانے اچکائے تھے۔ رضا کے لبوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ ابھری

تھی۔

"میرے لیے مجھ سے جڑے لوگ پہلے ہیں،اور پھر بعد میں، میں خود۔میری یہاں آنے کی بھی تو یہی وجہ ہے۔میں صرف اس ایک شخص کا مستقبل اچھا بنانے کے لیے یہاں آیا ہوں۔تاکہ اسے وہ سب دے سکوں جو وہ ڈیزرو کرتی ہے۔"،اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کو دیکھتے ہوئے کہا تو کچھ پلوں کے لیے کائی ٹھہر سا گیا۔پھر ہلکا سا مسکرایا تھا۔

"اتنا پسند کرتے ہو اسے؟"،رضا کی سوجی آنکھوں میں نمی جمع ہونے لگی تھی۔بمشکل اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔کائی کی آنکھوں میں نرمی ابھری تھی۔

"تو پھر چھوڑ کر کیوں آئے اسے؟"،اور یہاں رضا کے گلے میں گلٹی ڈوب کر ابھری تھی۔

"میں اسے اس کے لیے ہی چھوڑ کر آیا ہوں۔یہاں بھی اس کے لیے آیا ہوں۔"،اس نے دھیرے سے کہہ کر سر جھکایا تھا اور شہد رنگ آنکھیں اپنے جوتوں میں مقید پیروں پر ٹکا دی تھیں۔

"اسے معلوم ہے؟"،رضا نے دھیرے سے سر نفی میں ہلایا تھا۔

www.novelsclubb.com

"اور اگر وہ کسی اور کی ہو گئی تو؟"،اور یہاں رضا کی آنکھوں میں سایہ سا لہرایا تھا۔ایسا نہیں ہونا چاہئیے تھا۔اگر ایسا ہو گیا تو اس کی زندگی کا کیا فائدہ؟اور یہی بات تو اسے روحان سے پوچھنی تھی، جس کی ہمّت وہ خود میں نہیں پاتا تھا۔کیسے اس کی زندگی برباد کرنے کے بعد اس سے اپنے فائدے کی باتیں پوچھ لے وہ؟اور اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ ایمان کہاں ہے؟کس حال میں ہے؟زندہ ہے بھی یا۔۔۔؟اس سے آگے وہ نہیں سوچ پایا تھا۔

عین اسی لمحے اس کی جیب میں پڑا اس کا موبائل تھرتھرایا تھا۔بہت ہی مشکل سے ہمّت جمع کر کے اس نے جیب سے موبائل نکالا تھا۔اور سامنے لکھے نام کو پڑھ کر وہ ہچکچایا تھا۔سامنے حسنہ کا نام جگمگا رہا تھا۔کائی نے اسی لمحے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔یہ جیسے ایک تسلی دینے کا انداز تھا۔رضا نے ڈبڈبائی سرخ پڑتی آنکھوں کے ساتھ کال پک کر کے کان سے فون لگایا تھا۔کائی ہلکا سا مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔پھر اسے ایک آخری نظر دیکھ کر باہر چلا گیا تھا۔

اس کی کچھ بولنے کی ہمّت نہیں ہو رہی تھی۔وہ خاموش سا تھا۔کچھ کہنے کو بھی نہ تھا اور نہ کچھ پوچھنے کو تھا۔بات کہاں سے شروع کرنی تھی،یہ بھی معلوم نہ تھا۔بات بھی روحان نے ہی

شروع کی تھی۔

"ہیلو السلام علیکم رضا۔"، روحان کی متوازن ٹھہری ہوئی سی آواز اگلی جانب سے ابھری تو اس نے ضبط سے متورم سرخ آنکھیں بند کی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔"، اس نے بمشکل کمزور سی آواز میں کہا تو اگلی جانب روحان نے نہایت افسوس سے اپنے سامنے بیٹھی، لب کترتی ہوئی حسنہ کو دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی تھی۔

روحان نے سر جھٹکا تھا۔

"کیسے ہو، رضا؟"، اس نے دھیمے، نرم لہجے میں آرام سے کہا تو رضا کی آنکھوں سے ایک گرم گرم آنسو ٹپک کر رخسار پر نیچے بہتا چلا گیا۔ وہ کیسے اس اذیت میں بھی اس سے اس کی خیریت پوچھ رہا تھا ناں! اسے بے اختیار اپنے دل میں روحان کی محبت بڑھتی محسوس ہوئی تھی۔ اس کی قدر بہت بڑھ گئی تھی۔

"ٹھیک نہیں ہوں۔"، اپنے لبوں پر ہاتھ رکھے اس نے بمشکل اپنی آواز کی لڑکھڑاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی تھی، مگر وہ نہیں چھپا پایا تھا اس لڑکھڑاہٹ کو۔ روحان نے ضبط سے آنکھیں

www.novelsclubb.com

بند کر کے کھولی تھیں۔اس کی آنکھوں میں بھی نمی تیرنے لگی تھی۔"تم کیسے ہو؟"،اب رضا اگلی جانب سے پوچھ رہا تھا۔روحان کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ اٹکنے لگا تھا۔

"میں بھی ٹھیک نہیں ہوں۔"،اس نے دکھتے گلے کے ساتھ کہا تو رضا کا جی چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔اپنے دوست کی اذیت اور تکلیف کا سبب وہ بنا تھا اور اب یہ احساس اس کی تکلیف اور اذیت کا سبب بن رہا تھا۔

"آئی ایم سوری،روحان۔آئی ایم رئیلی سوری۔مجھے معاف کر دے،یار۔"،اور اس نے لبوں سے ہاتھ ہٹا کر اسی لڑکھڑاتے متورم لہجے میں شکست خوردگی سے کہا تو روحان کی تڑپ بڑھ گئی۔ بے اختیار اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

www.novelsclubb.com

"تیرا کوئی قصور نہیں،رضا۔ایمان کی مدد کرنے کا تو مجھے نہ بھی کہتا ناں،تب بھی میں اسے نہ چھوڑتا۔تو معافی مت مانگ۔"،وہ بولتے بولتے یکدم ہی رکا تھا۔اگلی جانب سے رضا کی مسلسل ہچکیوں اور سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔روحان نے ملامتی نظروں سے حسنہ کو دیکھا تھا جس کا چہرہ جھکتا چلا گیا تھا۔اور پھر اس نے دھیرے سے کہا تھا۔

"وہ ٹھیک ہے، رضا۔ وہ کراچی چلی گئی ہے۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے بس میں بٹھا کر الوداع کیا تھا میں نے اور بیچ راستے میں اس نے مجھے فون بھی کیا تھا اپنی خیریت بتانے کے لیے۔ تو اس کے لیے پریشان مت ہونا۔ تیری امانت کی حفاظت کرنے کی پوری کوشش کی ہے میں نے۔"، اور اس پل رضا نے سکون اور طمانیت سے آنکھیں موندی تھیں۔ وہ کرسی سے اتر تا زمین پر بیٹھتا چلا گیا تھا۔ گھٹنوں کے بل وہ اگلے ہی پل سجدے میں جھکا تھا۔ فون اب بھی ایک ہاتھ سے کان سے لگا رکھا تھا۔ اس نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ شکر گزاری کی معراج سجدہ ہوتا ہے۔ اور وہ شکر گزاری کی اس معراج پر پہنچا ہوا تھا۔ وہ رب کا جتنا شکر ادا کرتا، اتنا کم تھا۔

سب سے بڑی بے بسی وطن سے دوری کے سبب تھی۔ وہ وہاں ہوتا تو ان دونوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ وہ مر سکتا تھا مگر اپنے سے جڑے رشتوں کے ساتھ دھوکے بازی نہیں کر سکتا تھا۔ روحان یامین اسے بہت عزیز تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ اگر اس کا کوئی جڑواں بھائی ہوتا تو بالکل روحان جیسا ہوتا۔ ایمان کی فکر کچھ کم ہوئی تو روحان کی فکر میں دل بیٹھنے لگا۔

"تم۔۔۔ تم مجھے معاف کر دو، روحان۔"، اٹک اٹک کر اس نے متورم سرخ آنکھوں اور بھیگے

چہرے کے ساتھ کہا تو روحان کی آنکھوں سے بھی ایک آنسو ٹپک پڑا۔ یہ لڑکا اسے بہت عزیز تھا۔

"تیری کوئی غلطی نہیں، رضا۔ یہ سب ایسے ہی ہونا تھا۔ حسنہ نے جو کچھ کہا ہے، میں اس کے لیے تجھ سے معذرت چاہتا ہوں۔ وہ ذرا جذباتی ہو گئی تھی۔ تو اس کی باتوں کو سیریئس نہیں لے۔"، اس نے آہستہ آہستہ کہتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تھی۔ حسنہ نم سرخ آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ کیا خوب ہمّت سے نوازا تھا رب نے روحان یامین کو! اسے اس پر بے اختیار ہی بہت فخر ہوا تھا۔

"تو مجھے بہت عزیز ہے، روحان۔۔۔ بہت، بہت زیادہ! میرا یقین کر۔"، رضا کی آنکھوں سے اب تک آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے۔ آواز زکام زدہ سی ہو رہی تھی۔ آنکھیں اب تک دہک رہی تھیں۔ وہ اب تک زمین پر ہی بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ چمکتے ہوئے سرمئی ماربلز پر رکھا ہوا تھا جبکہ دوسرے سے فون کان کے ساتھ لگا رکھا تھا۔

"تجھے یقین دلانے کی ضرورت نہیں ہے، رضا۔ میں جانتا ہوں۔"، وہ اب اگلی جانب اپنا چہرہ

رگڑ کر پونچ رہا تھا۔ صاف کر رہا تھا۔ باہر رات قطرہ قطرہ بیت رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک بات کرتے رہے تھے پھر انہوں نے فون رکھ دیا تھا۔ رضا کافی شاپ پر آن ڈیوٹی تھا اور روحان کو آرام کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

رمیص جہانزیب کے گھر کے باہر اس وقت ایک سیاہ رنگ کی چمچماتی کار آ کر رکی تھی۔ چوکیدار نے فوراً سے گاڑی دیکھ کر دروازہ تیزی سے کھولا تھا۔ گاڑی اگلے ہی پل زن سے گھر میں داخل ہوتی جا کر سیدھی پورچ میں رمیص کی گاڑی کے پیچھے رکی تھی۔ اگلے ہی پل اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیور باہر نکلا تھا اور پچھلی سیٹ کی جانب بڑھ کر دروازہ تیزی سے کھولا تھا۔

گاڑی سے اگلے ہی پل ایک عمر رسیدہ سے آدمی باہر آئے تھے۔ سیاہ ٹی شرٹ کے ساتھ آف وائٹ رنگ کی پینٹ پہنے، وہ دراز قد تھے۔ گوری چٹی سی صاف رنگت کے حامل، سفید و سرمئی چاندی کی مانند چمکتے بالوں والے، وہ آنکھوں کو سیاہ چشموں کے پیچھے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان کی

شخصیت میں ایک منفرد سا رعب اور دبدبہ جھلکتا تھا۔لب سنجیدگی سے سی رکھے تھے۔انہوں نے قدم سامنے گھر کے مین گیٹ کی جانب بڑھائے تھے۔

انداز اور چال نہایت سلجھی ہوئی، سنجیدگی سے بھرپور تھی۔گھر کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اندر کی جانب بڑھ گئے تھے۔ان کے ہر ہر انداز سے یہ صاف واضح تھا کہ وہ اس گھر کے ہر حصّے سے واقف تھے۔وہ اس گھر اور اس کے مکینوں کے لیے شناسا تھے۔ابھی وہ آگے بڑھتے ہوئے، ہاتھ پہلو میں لہراتے ہوئے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچے ہی تھے کہ سامنے صوفے پر بیٹھی لڑکی یکدم ہی انہیں دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔اس کے ہاتھ سے ایک قلم اور ڈائری بھی نکل کر فرش پر جا گری تھی۔شاید وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔

گلابی رنگ کے سادہ سے لباس میں ملبوس، شانوں پہ دوپٹہ پھیلائے وہ انہیں ہی یک ٹک دیکھتی جا رہی تھی۔اس کی سیاہ آنکھوں میں شناسائی کی رمق ابھری تھی۔آنکھیں حیرانگی سے پھیلتی چلی گئی تھیں۔لب کھلتے چلے گئے تھے۔مگر وہ اب تک اسے نا سمجھی اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔یہ کون تھی اور ان کی بیٹی کے گھر میں کیا کر رہی تھی؟

ایمان کو یکدم ہی جیسے ہوش سا آیا تھا۔اس نے دوپٹے کا پلو فوراً سے ایک ہاتھ سے پکڑ کر سر پر رکھا تھا۔پھر نظریں جھکاتے ہوئے وہ زمین پر بیٹھی تھی اور زمین سے اپنی ڈائری اور قلم اٹھایا تھا، پھر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔وہ اب بھی سوالیہ نگاہوں سے اسے تکتے جا رہے تھے۔

"السلام علیکم۔"، لڑکی نے دھیرے سے سلام کیا تو انہوں نے اسی سنجیدگی بھری نا سمجھی کے ساتھ سر ہلکا سا ہلایا تھا۔

"وعلیکم السلام۔"، وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔پھر ڈائری بند کر کے سینے سے لگاتی قدم قدم چلتی ان کے قریب آئی تھی۔

"آپ غزل کے بابا ہیں؟"، اس کے دھیرے سے مدھم آواز میں پوچھنے پر انہوں نے بلا کسی تردد سر اثبات میں ہلایا تھا۔نگاہوں میں اب بھی سوال پنہاں تھا۔

"میں ان کو بتا دیتی ہوں۔"، وہ آہستہ سے کہتی ہوئی ان کے ساتھ سے نکلتی ہوئی ڈرائنگ روم سے چلی گئی تھی۔پیچھے وہ سر جھٹک کر اندر بڑھ آئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد غزل ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔اس کی آنکھیں نم تھیں اور چہرے پر

www.novelsclubb.com

ایک الوہی سی محبت جھلک رہی تھی۔وہ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ فوراً سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔وہ بھی ان کی جانب ہی بڑھ آئی تھی۔

"السلام علیکم بابا۔"،نم آواز و لہجے میں کہتی ہوئی وہ انہیں بہت ٹوٹی بکھری سی لگی تھی۔ان کی آنکھیں بالکل غزل کی آنکھوں جیسی تھیں۔ہیزل رنگ کی۔خوبصورت آنکھیں۔اس وقت ان کی آنکھیں بھی ہلکی نم سی ہو رہی تھیں۔وہ آگے بڑھ آئی تھی۔انہوں نے بے اختیار ہی اسے شانوں سے تھام کر خود سے دھیرے سے لگایا تھا۔

ان سے الگ ہو کر غزل نے چہرہ اٹھا کر ان کو دیکھا تھا۔وہ انہیں پورے تین مہینوں کے بعد دیکھ رہی تھی۔وہ رمیص کے انتقال پر پاکستان آئے تھے۔اور پھر پورا ایک مہینہ اس کے پاس ہی رک کر گئے تھے۔مگر پھر ان کا واپس مانچسٹر جانا بھی ضروری تھا۔وہاں ان کا بزنس تھا۔اور ان کے علاوہ کوئی بزنس کو دیکھنے والا بھی نہ تھا۔اب وہ بہت مشکلوں سے اپنے امور میں سے وقت نکال کر اس کے پاس آئے تھے۔

غزل کی آنکھوں کی نمی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔وہ دونوں ساتھ ہی ایک

صوفے پر بیٹھے تھے۔ غزل نے نگاہیں جھکا رکھی تھیں۔ مگر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھے بغیر بھی بتا سکتے تھے کہ وہ اپنے آنسو روکے ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ ضبط سے سرخ پڑنے لگا تھا۔ انہوں نے بہت دکھ سے اسے دیکھا تھا۔

"ٹھیک ہو؟"، انہوں نے چہرہ ہلکا سا ترچھا کر کے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔ پھر اس نے آہستہ سے اپنی نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کی نمی بڑھتی چلی گئی تھی۔ اور پھر یکدم ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ ارشد صاحب کا دل کسی نے آری سے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ انہیں اپنی اولاد بے حد عزیز تھی اور اب وہی اولاد ان کے سامنے اس بری طرح رو رہی تھی تو ان کا اپنا دل بھی خون کے آنسو رو رہا تھا۔

"میں ٹھیک نہیں ہوں، بابا۔ ٹھیک نہیں ہوں میں۔"، وہ منہ پر ہاتھ رکھے نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولتی جا رہی تھی اور وہ اس کو افسوس سے تکتے جا رہے تھے۔ ان کی اپنی آنکھوں میں بھی نمی در آئی تھی۔ انہوں نے یکدم ہی آگے بڑھ کر اس کو شانے سے تھام کر خود سے لگایا تھا۔ پھر وہ نرمی

www.novelsclubb.com

سے اس کی پیٹھ تھپکنے لگے تھے۔

"ہمّت کرو، غزل۔ میں ہوں ناں تمہارے دکھ سمیٹنے کے لیے۔"، وہ آہستہ آہستہ مختصر الفاظ میں اسے تسلّی دیتے ہوئے کہتے جا رہے تھے اور وہ روتی جا رہی تھی۔ اس کا وجود ہچکولے کھا رہا تھا۔ اور ارشد صاحب کو اپنا دل دھاڑیں مار مار کر روتا ہوا سنائی دے رہا تھا۔ اولاد کی تکلیف یوں ہی تو دل چیر کر رکھ دیتی ہے۔

"میں نے آپ کو بہت یاد کیا، بابا۔ بہت زیادہ۔"، وہ رونے کے درمیان بولی تو انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔

"میں نے تو تم سے کہا تھا کہ چل لو میرے ساتھ۔"، وہ جیسے ملائمت سے کہہ رہے تھے۔ غزل نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"نہیں جا سکتی میں آپ کے ساتھ۔ مجھے سمجھیں، بابا۔ آپ تو مجھے سمجھیں۔"، اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ سپید چہرہ سرخ پڑ کر دہکتا محسوس ہونے لگا تھا۔ کوئی اندیکھی شے رفتہ رفتہ دل کو مٹھیوں میں زوروں سے بھینچ رہی تھی۔

"اچھا اوکے۔"، انہوں نے کہتے ہوئے اسے خود سے دور کیا تھا۔ پھر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھامے انگوٹھوں سے اس کی بھیگے رخسار صاف کرنے لگے تھے۔ نم آنکھیں اس کی آنکھوں پر ہی ٹکی تھیں۔ "تم روؤ مت۔ طبیعت خراب ہو جائے گی تمہاری۔"

غزل نے سر ہلاتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی پشت سے اپنے رخسار صاف کیے تھے، پھر ایک بھیگا سانس خارج کر کے اس نے انہیں متورم سرخ آنکھوں سے دیکھا تھا۔

"کتنے دنوں کے لیے آئے ہیں آپ؟"، بھیگی آواز میں پوچھتے ہوئے وہ اب بھی ہاتھوں سے اپنا چہرہ پونچ رہی تھی۔ انہوں نے نرم پڑتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا، اور پھر ہلکا سا مسکرائے تھے۔

www.novelsclubb.com

"کیس کے بعد جاؤں گا۔"، اور ان کے نرمی سے مسکرا کر کہنے پر غزل کی آنکھیں اور رخسار رگڑتے ہاتھ ساکت ہوئے تھے۔ اس نے آنکھوں میں بے پناہ شاک لیے انہیں دیکھا تھا۔

"کیا؟"، وہ سمجھی کہ شاید اس کے سننے میں غلطی ہوئی ہے، مگر وہ توقع کے برعکس ایک بار پھر مسکرائے تھے۔

"جانتی ہو غزل؟ میں رمیص کو بہت سمجھایا کرتا تھا کہ وہ ان بڑے لوگوں سے پنگے نہ لے۔ اپنے اور اپنے بچوں کے بارے میں سوچے۔ اپنی بیوی کے بارے میں سوچے۔ ہمارے بارے میں سوچے۔ مگر وہ کبھی سنتا ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ ایک ہی جواب دیا کرتا تھا کہ میں بزدل نہیں بننا چاہتا۔ میں بہادر بننا چاہتا ہوں۔"، وہ نرمی سے بولتے بولتے ایک پل کو ٹھہرے تھے۔ نرم آنکھیں اب بھی اس کے چہرے پر ہی جمی تھیں۔ "اور آج مجھے تمہیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ تمہاری اس سے شادی کرنے کا میرا فیصلہ بالکل درست تھا۔ بہادر کی صحبت میں تم بھی بہادر ہو گئی ہو۔ میری اور ضوفی کی طرح بزدل نہیں ہو۔ برائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرّا کر کہتی ہو کہ تم برے ہو۔ تم غلط ہو۔ آہ! کاش ہم میں بھی یہ ہمّت ہوتی۔"

www.novelsclubb.com

انہوں نے کہتے ہوئے ایک سرد آہ بھری تھی۔ نگاہیں اب بھی ساکت سی غزل پر ہی جمی تھیں۔ وہ رونا بھولے انہیں تکتی جا رہی تھی۔

"مجھے سمجھ آ گیا ہے کہ میں کب سے پاگلوں کی طرح شیر کو بل میں بند کرنے کا سوچ رہا تھا۔ جبکہ شیر تو بل میں بند ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو جنگل کا بادشاہ ہے۔ وہ ڈرتا نہیں ہے۔ وہ ہماری طرح

کم ہمّت نہیں ہوتا ہے۔۔۔میں غلط کر رہا تھا۔کم ہمّت انسان میں ایک برائی ہوتی ہے۔وہ دوسروں کو بھی ڈرا پھسلا کر ان کی ہمّت کم کرنے لگتا ہے۔میں اور ضوفی بھی تمہارے ساتھ یہی کر رہے تھے۔بھول گئے تھے کہ تم کس کی بیوی ہو۔"،وہ اسے دیکھتے اذیت اور دکھ سے بول رہے تھے۔غزل چپ چاپ انہیں سنے گئی تھی۔کیا کہتی وہ؟کہنے کے لیے لفظوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔وہ متورم آنکھوں سے انہیں دیکھے گئی تھی۔

"مجھے تمہارا اور تمہارے بچوں کا تحفظ چاہیئے تھا،غزل۔اور کچھ نہیں۔مگر اب جب تمہاری یہ بات مجھے سمجھ آئی ہے تو تم مجھے ہر وقت،ہر لمحہ اپنے ساتھ کھڑا پاؤ گی۔میں تمہارے ساتھ ہوں،میری غزل۔"،کہتے ہوئے ایک بار پھر انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔اپنی بیٹی کو وہ کیسے چھوڑ سکتے تھے۔

اور پھر یہاں ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اگر کچھ باپ زاویار احمد جیسے ہوتے ہیں تو بہت سے ارشد صاحب جیسے بھی ہوتے ہیں۔جس طرح کسی ایک انسان کی وجہ سے باقی تمام انسانوں کو غلط نہیں کہا جا سکتا،عین اسی طرح کسی ایک مثال کی بنا پر باقی تمام لوگوں کو غلط نہیں کہا جا

www.novelsclubb.com

سکتا۔

☆☆☆

**"اے ابن آدم، کیا جانتے ہو کیا ہے امید؟**

**ڈوبتے کو تنکے کا سہارا دینے والی ہے امید"**

یہ لندن کی مصروف سی سڑک کا منظر تھا۔آج اسے یہاں آئے ایک مہینہ ہو چکا تھا۔وہ اس وقت کافی شاپ سے گھر واپس جا رہا تھا۔اس کی آج کی شفٹ ختم ہو چکی تھی۔اس وقت رات کا اندھیرا ہر سو پھیلا ہوا تھا مگر لندن جیسے مصروف شہر میں رات کا اندھیرا بھی تو اپنے سنگ چمکتے جگنو ساتھ لاتا ہے ناں۔لندن بھی کسی روشن سیّارے کی مانند جگمگ کر رہا تھا۔

www.novelsclubb.com

مون سون ختم ہو چکا تھا۔خزاں کا آغاز تھا۔آج کل ہر سو،ہر جانب ڈھیروں زرد پتّے بکھرے نظر آتے تھے۔وہ ہلکی پھلکی سی نیلی ٹی شرٹ کے نیچے نیلی ہی جینز پہنے ہوئے تھا۔شہد رنگ آنکھوں میں ایک عجیب سی سنجیدگی چھائی تھی۔لب ایک سیدھ میں بند تھے۔آنکھوں کے ہم

رنگ بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔وہ خاموش قدم آگے ہی آگے بڑھاتا جارہا تھا۔کانوں میں ایئر پیس لگا رکھے تھے۔ان ایئر پیسز میں ایک سنجیدہ متوازن سی آواز گونج رہی تھی۔

"راہ گزر زندگی مشکل ہے۔انسان کو توڑ بھی دیتی ہے اور وقت آنے پر جوڑ بھی دیتی ہے۔مگر جانتے ہیں کہ وہ کیا شے ہے جس کے سہارے ایک انسان قدم قدم چلتا ہوا اس موڑ تک پہنچتا ہے جہاں آکر وہ جڑنے لگتا ہے؟"،وہ رمیص جہانزیب کی آواز تھی۔وہ بہت دھیرے دھیرے بہت اہم اور گہری باتیں کرتا جارہا تھا۔یہ اس کا ریکارڈڈ شو تھا۔یہاں وہ چیف گیسٹ کے طور پر کسی اور شو پر بلایا گیا تھا،اور جب اس سے عوام کے لیے کوئی نصیحت دینے کا کہا گیا تو اس نے یہ الفاظ کہے تھے۔

www.novelsclubb.com

"امید۔امید ہے وہ شے جو ایک مرتے ہوئے انسان کو بھی یہ یقین دلائے رکھتی ہے کہ شفاء ممکن ہے۔ہارے ہوئے شکست خوردہ انسان کو جیت اور فتح کی خواہش رکھنا بھی یہ امید ہی سکھاتی ہے۔دنیا میں کوئی شے ناممکن نہیں،یہ بھی امید ہی سکھاتی ہے۔"،رمیص کے الفاظ اور اس کا انداز،سب نہایت سلجھا ہوا تھا۔جیسے وہ بہت پر اعتماد ہو ان الفاظ پر۔بہت یقین ہو اسے ان

الفاظ پر۔رضا پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پیدل ہی اپنے ہاسٹل روم تک جا رہا تھا۔اس کا چہرہ اور چال بہت سنجیدہ تھی۔اس کی شہد رنگ آنکھوں میں بھی اتنی ہی سنجیدگی پنہاں تھی۔اب کے وہ داہنے جانب مڑا تھا۔سامنے سے ایک لمبی سی چوڑی گلی شروع ہوتی تھی جس کے دونوں اطراف میں اونچی نیچی عمارتیں بنی تھیں۔روڈ خاصا صاف ستھرا سا تھا۔وہ فٹ پاتھ پر چڑھ گیا تھا۔آس پاس لوگ آگے پیچھے جاتے جا رہے تھے۔اس بات سے بے خبر کہ کوئی ہے ان میں ہی جو ٹوٹا ہوا ہے، بکھرا ہوا ہے، مگر پھر بھی نجانے کیسے چلتا جا رہا ہے۔اس کی نظریں لندن کی روشنیوں پر نہیں تھیں۔اس کی نظریں سڑک کے سرمئی رنگ پر ٹکی تھیں۔۔۔

"امید انسان کو تب ہمّت دیتی ہے جب وہ حوصلہ ہارے بیٹھا ہوتا ہے۔جب اسے لگ رہا ہوتا ہے کہ اب کبھی کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔اب سب کچھ ختم ہو جائے گا۔تب ڈوبتے ہوئے انسان کو جو ایک چھوٹے سے تنکے کا سہارا ملتا ہے ناں، وہ امید ہوتی ہے۔یہ چھوٹا سا تنکا کب ایک تناور شجر بن جائے، کون جانے۔"، رمیص کی متوازن سنجیدہ سی آواز اس کی سماعتوں میں رس گھولتی جا رہی تھی۔کیسے ایک ایسا انسان جواب نہیں تھا، وہ اسے تقویت بھرے لفظ بخش رہا تھا۔اسے

امید کی اس راہ پر چلنے کو کہہ رہا تھا، جس پر سے شاید وہ بھٹک چکا تھا۔ہاں وہ بھٹک ہی تو چکا تھا۔

"ایمان کو پختگی امید بخشتی ہے۔کیا کبھی کسی مومن کو ناامید دیکھا ہے؟"،وہ اب پوچھ رہا تھا،اور ارتضی مراد کو لگا کہ رمیص جہانزیب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے پوچھ رہا ہے۔ سوال کر رہا ہے۔۔۔یا پھر۔۔۔جواب تھما رہا ہے!اس کی شہد رنگ آنکھوں میں گلابی پن سا اترا تھا۔

"امید انسانوں سے نہیں،اللہ سے لگانا سیکھو۔ایک وہی ہے جو اس لگائی ہوئی لو کے بدلے نعمتوں سے نوازتا ہے۔بدلے میں تکلیف اور اذیت نہیں،رحمتوں کے انبار لگاتا ہے۔اطمینان کی نعمت بخشتا ہے۔"،وہ چلتے ہوئے ایک خاصی وسیع سی جگہ پر پہنچ گیا تھا۔اس کے عین سامنے لوہے کا ایک گرل شدہ دروازہ تھا۔دروازے کے ساتھ ہی چوکیدار مستعد سا کھڑا تھا۔بارہ بج گئے تھے۔بارہ بجے ہاسٹل کے تمام دروازے مقفل کر دیے جاتے تھے۔آج اسے آتے آتے دیر ہو گئی تھی۔ورنہ روز وہ گیارہ بجے تک ہاسٹل میں ہوا کرتا تھا۔چوکیدار نے اسے ایک سنجیدہ نظر دیکھا تھا۔وہ شاید اسی کا منتظر تھا۔

"Where were you?"

(تم کہاں تھے؟)چوکیدار نے خاصی تفتیش لہجے میں سموئے، آنکھیں سکیڑے اسے دیکھ کر پوچھا تھا۔

"کافی شاپ۔"،اور وہ یک لفظی جواب دے کر اندر بڑھ آیا تھا۔وہ تو یوں بھی کم گو تھا۔ مگر لندن آنے کے بعد تو وہ جیسے بولنا ہی بھول گیا تھا۔وہ بہت ہی کم بات کرنے لگا تھا۔ڈیوٹی کے علاوہ اگر وہ کسی سے بات چیت کر لیا کرتا تھا تو وہ کائی تھا۔چند جملے تو وہ اس سے بول ہی لیا کرتا تھا۔وہ سنجیدگی سے جیبوں میں اپنے ہاتھ اڑسے اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔رمیص جہانزیب کی مزید باتیں اور مزید الفاظ اب بھی اس کی سماعتوں میں گونج رہے تھے۔

**" تاریکی کو روشنی میں بدلنے والی ہے امید**

**مسافر کو منزل تک، بیمار کو شفا تک**

**طائر کو فلک تک، پہنچانے والی ہے امید"**

ہسپتال کا وہ کمرہ اب پہلے سے قدرے کم خاموش تھا۔روحان پشت تکیوں سے ٹکائے،پہلے سے بہتر لگتا تھا۔چہرے پر موجود بہت سے زخم اب مندمل ہونے لگے تھے۔آنکھوں کی ویرانی عنقا تو نہیں،البتہ کم ضرور تھی۔اس کے عین سامنے رکھے صوفے پر حسنہ اور رانیہ بیٹھے کچھ باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ان کے چہروں پر پہلے والی بشاشت تو نہیں،البتہ وہ بے چینی اور اضطراب بھی نہ تھا۔

زندگی اپنے معمول پر تو آنے لگی تھی۔مگر سب کچھ پھر سے ویسا کیسے ہو سکتا ہے؟ہاں مگر اس کی آنکھوں میں ایک امید سی جھلکتی تھی۔اس کے چہرے پر سنجیدگی حد درجہ تھی۔بازو پر لگے پلستر پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد اس نے رخ موڑ کر سائیڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھایا تھا۔چند نمبرز ڈائل کر کے اس نے فون کان سے لگایا تھا۔کچھ گھنٹیوں بعد ہی کال اٹھائی جا چکی تھی۔

"ہیلو حامد۔میری سک لیو ایک مہینے تک بڑھوا دو۔میں ایک مہینے کے بعد یونیورسٹی آؤں گا۔"، وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔آنکھوں میں اب بھی کہیں ایک ملال سا دکھتا تھا۔اپنے پیروں پہ کھڑے نہ ہو پانے کا ملال۔ایک بستر تک محدود ہو جانے کا ملال۔مگر قسمت کے کھیل خدا ہی

جانے!

جبھی اس نے حسنہ کو اٹھ کر خود تک آتے ہوئے دیکھا تھا۔اس کے ہاتھ میں فون تھا۔اس کا اپنا فون۔آنکھیں بے تاثر دکھتی تھیں۔وہ فون اس کی جانب بڑھا رہی تھی۔روحان نے ایک نظر چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔حسنہ دھیرے سے مسکرائی تھی۔

"یہ ڈاکٹر مائیکل گرین ہیں۔کینیڈا کے بہترین آرتھوپیڈک ڈاکٹر۔ثناء سے بات ہوئی تھی میری کل۔اس نے بتایا تھا کہ ان کے پاس بھی جا سکتے ہیں ہم۔"،وہ سنجیدگی سے بولتی جا رہی تھی اور روحان سر ہلاتے ہوئے اسے توجہ سے سن رہا تھا۔"اور ثناء نے ان سے تمہارا کیس ڈسکس بھی کیا تھا۔انہوں نے تمہاری رپورٹس مانگی ہیں ساری۔وہ تفصیل جاننا چاہتے ہیں۔"

"ہم وہاں کیسے جائیں گے،حسنہ؟"،اس نے بات مکمل ہونے کے بعد نہایت سادگی سے پوچھا تھا۔

"کیا مطلب؟کیا کہنا چاہتے ہو؟ہم وہاں جا سکتے ہیں۔اللہ نے اتنا تو دیا ہے ہمیں۔"،وہ نجانے کس بات پر ناراض ہوئی تھی،روحان کو سمجھ نہیں آئی۔وہ بس ہلکا سا مسکرایا تھا۔

"میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ چلے تو جائیں گے۔ مگر آگے کیا کریں گے؟ کیسے مینج کریں گے سب؟ یہاں رانیہ اور امّاں اکیلی ہو جائیں گی۔اور خالہ بھی نجانے تمہیں جانے دیں یا نہیں۔۔۔"،اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔اور حسنہ روحان سمجھ بھی چکی تھی۔روحان کو ہسپتال میں دوسرا ماہ شروع ہو چکا تھا۔اس سارے وقت میں اس نے خالہ کے چہرے پر فکر کے ساتھ ساتھ ایک عجیب کشمکش بھی دیکھی تھی۔وہ جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی تھیں۔۔۔ مگر اس کے اندیشے پہ مہر تب ثبت ہوئی جب کل شام حسنہ اور خالہ کو اس نے بات کرتے ہوئے سنا۔

**وہ سویا ہوا تھا مگر اس کا دماغ جاگا ہوا تھا۔حسیات الرٹ تھیں۔خالہ اور حسنہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ سو چکا ہے، مگر وہ سویا نہیں تھا۔**

**"حسنہ، تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے اب؟"،خالہ بہت سنجیدگی سے اپنے سامنے بیٹھی حسنہ سے استفسار کر رہی تھیں۔حسنہ نے نگاہیں چرا کر سامنے سوئے روحان کو دیکھا تھا۔کیا وہ کچھ سوچ سکتی تھی؟ کیا اس میں اتنی ہمّت تھی؟**

**"کچھ نہیں سوچا،امی۔"**

www.novelsclubb.com

"کیوں؟زندگی ضائع کرنی ہے کیا اپنی؟"،ان کے لہجے میں سختی سی در آئی تھی۔آنکھوں میں بھی ناگواری اتری تھی۔چہرے کی کرختگی میں اضافہ ہوا تھا۔

"ضائع کرنے کی کیا بات،امی؟روحان شوہر ہے میرا۔"،اس نے آنکھیں موڑ کر ان کو دیکھا تھا۔اب کے آنکھوں میں سنجیدگی ہی سنجیدگی تھی۔وہ جیسے ایک ہی لمحے میں کسی فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔

"دیکھو حسنہ۔تم میری بیٹی ہو۔تمہاری خوشیاں دیکھنا میری خواہش ہے۔روحان بہت اچھا بچّہ ہے۔۔۔مگر۔۔۔"،اور انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔اور اکثر ادھوری چھوڑی باتوں کی کاملیت بہت بھاری ہوتی ہے۔وہ اکثر کہہ دی جانے والی باتوں سے زیادہ ظالم ہوتی ہیں۔

"تمہارے لیے اب بھی رشتے آرہے ہیں۔تمہاری ابھی عمر ہی کیا ہے؟کیوں خود کو برباد کرنے پہ تلی ہوئی ہو۔ڈاکٹرز نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ اس کے صحیح ہونے کے کوئی چانسز نہیں ہیں۔اور اگر ہو بھی جائے صحیح تو ایک خلاء ہمیشہ رہے گا۔یہ ویسے نہیں چل پائے گا جیسے پہلے چلا کرتا تھا۔جو شخص تمہارے قدموں سے قدم نہ ملا سکے،تم اس کے ساتھ ساری زندگی

کیسے گزارو گی؟ تمہیں مشکل ہو جائے گی۔"، وہ تفکر اور پریشانی سے کہتی جا رہی تھیں اور حسنہ کو لگ رہا تھا کہ گویا کوئی اس کے دل کو پکڑ کر زوروں سے جھنجھوڑ رہا ہو۔ گویا دل سے خون رس رہا ہو۔ اس کا درد اس لمحے سوا ہوتا محسوس ہوا تھا۔ یہ تو خیال ہی سوحان روح تھا۔ عملی جامہ کیسے پہنایا جاتا اسے؟

"اگر روحان میرے قدموں سے قدم نہیں ملا سکے گا، تو کوئی بات نہیں۔ میں اس کے قدموں سے قدم ملا لوں گی۔ اور امی آپ یہ بات آئندہ کبھی نہیں کریں گی۔ میری عمر چاہے کتنی بھی ہو، مگر یہ تو طے ہے کہ یہ ساری کی ساری روحان یامین کے لیے وقف کر دی گئی ہے۔ روحان کے بغیر میری زندگی میں خلاء ہی خلاء ہے۔ یہ تو شاید میرے بغیر زندہ رہ ہی لے، مگر میں۔۔۔"، اس کی آنکھوں سے ایک گرم گرم آنسو پلکوں کی باڑ کو توڑتا ہوا رخسار پر بہتا چلا گیا تھا۔ "میں اس کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتی، امی۔ روحان میری پہلی محبت ہے۔۔۔ اور آخری بھی۔ میری زندگی اور دل میں اس کے علاوہ اور کسی کی کوئی جگہ نہیں ہے۔"، اور وہ دہکتے لہجے میں کہتی اٹھ کر اس تک چلی آئی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ آنکھیں گلابی ہو رہی

تھیں۔روحان کو یاد تھا کہ اسے اس کے بعد اپنی پھیلی ہتھیلی پر کئی گرم گرم قطرے گرتے محسوس ہوئے تھے۔

"میں نے خالہ اور امی سے بات کی ہے کہ ہماری رخصتی کروادیں۔ تمہیں کیئر کی ضرورت ہے اور مجھ سے بہتر کیئر تمہاری کوئی نہیں کر سکتا۔"،اس نے دھیرے سے کہا تو روحان کی آنکھیں پھیلیں۔وہ اب بھی کہتی جارہی تھی۔"تمہاری بیوی ہوں میں۔مجھے تمہارے ساتھ کہیں بھی جانے سے، کوئی نہیں روک سکتا۔میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ چھوڑ دیا تو خود سے اور اپنے دل سے نظریں کیسے ملاؤں گی؟"،وہ کہتے کہتے آخر میں بہت معصومیت سے سوال کر بیٹھی تھی۔روحان کو اس لمحے اس پر بے تحاشا پیار آیا تھا۔کون کہتا تھا کہ محبت اب ختم ہونے لگی ہے؟آج کے دور میں محبت میں وہ صدق نہیں رہا؟

ارے عاشق عاشق کی بات ہے۔ عشق عشق کی بات ہے۔ورنہ انسان اب بھی ویسے ہیں اور جذبات بھی!

اس کے ساتھ اس کی آزمائش میں کھڑی ہونے والی حسنہ روحان تھی۔اس کی سب سے بڑی

سپورٹ۔اللہ کے بعد اگر وہ کسی کے بھروسے خود کو کر چکا تھا، تو وہ اس کی بیوی تھی۔اس کی حسنہ۔ حسین ترین۔وہ اسے امید دیتی تھی۔زندگی جینے کی امید۔آزمائش پار کرنے کی امید۔ اور یہ امید ہی تو ہے جو ایک اپاہج اور معذور انسان کو بھی یہ یقین دلائے رکھتی ہے کہ قدموں پہ کھڑا ہونا ممکن ہے۔زندگی میں آگے بڑھنا ممکن ہے۔زخموں کا مندمل ہو جانا ممکن ہے!

**"بے سبب زندگی کو باسبب جو بنا ڈالے**

**چشمِ نابینا کو نورِ چشم عطا جو کرے"**

اسے غزل کے ساتھ رہتے یہ دوسرا مہینہ تھا۔ان سارے دنوں میں بہادر بھائی نے اس کے لیے چند ایک محفوظ مقامات کا بندوبست کرنے کی کوشش کی تھی، مگر ہر بار کوئی نہ کوئی مسئلہ آڑے آ جاتا۔کوئی گرلز ہاسٹل ہوتا تو وہاں کا ماحول اچھا نہ ہوتا۔کوئی کرائے کا مکان ہوتا تو اکیلے رہنے کا مسئلہ ہوتا۔ایسے میں غزل نے اسے ایک پیشکش کی تھی۔اس نے اسے اپنے گھر پہ ہی پیئنگ گیسٹ رکھ لیا تھا۔جو کمرہ اس کے زیر استعمال تھا، وہ اب اس کا ماہانہ کرایہ دے دیا کرتی تھی۔

غزل نے تو یہ کرایہ لینے سے بھی منع کر دیا تھا، مگر اسے خود بہت عجیب لگ رہا تھا یوں مفت میں رہنا۔

اب اسے ایک محفوظ ٹھکانہ بھی میسر ہو گیا تھا اور ایک اچھا گھرانہ بھی۔ وہ گھنٹوں غزل کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے گزار دیا کرتی۔ ثمرین کے ساتھ کبھی کچن میں لگ جاتی تو کبھی ارحم کو پڑھانے بیٹھ جاتی۔ اور تو اور، اس نے غزل کے ساتھ باغبانی کرنا بھی شروع کر دی تھی۔ اسے کبھی گارڈننگ کا شوق نہیں رہا تھا، مگر ان پودوں کے ساتھ رہ کر زندگی پہلے سے کچھ بہتر لگنے لگی تھی۔ اس کا موڈ فریش اور ہلکا پھلکا رہنے لگا تھا۔

ایسے ہی ایک دن وہ صبح سویرے، فجر کے بعد غزل کے ساتھ لان میں بیٹھی تھی۔ سبز بچھی گھاس پہ وہ دونوں آلتی پالتی مارے ایک دوسرے کے مقابل بیٹھی تھیں۔ غزل مسکرا کر اسے رمیص کی کوئی بات بتا رہی تھی جب بولتے بولتے وہ یکدم ہی رکی۔

"ارے میں تو تمہیں بتانا ہی بھول گئی۔"، اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا تھا۔ ایمان نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"بابا کے ایک دوست کا ٹریننگ سینٹر ہے۔وہاں پر ایک کورس شروع ہو رہا ہے۔۔۔آرٹ کورس۔اس میں پینٹنگ،اسکیچنگ،کرافٹ سے لے کر بہت سی چیزیں سکھائی جائیں گی۔ تمہارا آرٹ تو ویسے بھی بہت اچھا ہے۔تم یوں کیوں نہیں کرتی کہ ادھر داخلہ لے لو۔بابا بتا رہے تھے کہ جس اسٹوڈنٹ کی پرفارمنس سب سے اچھی ہوئی،اسے آگے بھی گائیڈ کیا جائے گا۔ہو سکتا ہے کہ وہیں کوئی جاب دے دی جائے۔"،اس نے آخر میں دھیرے سے شانے اچکائے تھے۔ایمان نے بیزاری سے سر نفی میں ہلایا تھا،مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی،غزل بول پڑی تھی۔

"ایمان،تم حیدر آباد سے کوئی قارون کا خزانہ نہیں لے کر آئی ہو۔تھوڑے سے ہی تو پیسے ہیں۔ کب تک ان پر گزارا کرو گی؟کیا ہمیشہ آلسی بنی بیٹھی رہو گی؟"،غزل کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔چہرہ بھی سنجیدہ کر لیا تھا۔ایمان نے منہ پھولایا تھا۔

"مگر۔۔۔"

"مگرو گر کچھ نہیں۔اتنی سست نہ بنو۔نکلو باہر۔کچھ کرو۔اپنے پیروں پہ کھڑی ہو۔اپنا ایک نام

بناؤ۔ایک پہچان بناؤ۔تم میں ٹیلنٹ ہے تو اسے یوز کرو۔"،وہ بولتی جارہی تھی اور ایمان اسے دیکھتی، سنتی جارہی تھی۔غزل بولنے پہ آتی تو بالکل رمیص کی ہی طرح بولے چلی جاتی۔اسے چپ کروانا پھر کسی کے بس کی بات نہ ہوتی۔

"میں تمہارا نام پہلے ہی فہرست میں ڈلوا چکی ہوں۔تمہیں تو صرف اطلاع دے رہی ہوں۔ اگلے ہفتے سے کلاسز شروع ہیں۔بی ریڈی۔اور ہاں۔۔۔"،وہ ایک بار پھر رکی تھی۔اس کی ہیزل رنگ آنکھیں مسکرائی تھیں۔بھرا بھرا سا چہرہ ایکسائٹمنٹ سے گلابی ہوا تھا۔

"تم اپنا بی فارم وغیرہ تو لائی ہو ناں؟"،اس کے پوچھنے پر ایمان نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

"اوکے پھر۔کل ریڈی رہنا۔کل تم ثمرین کے ساتھ نادرا جاؤ گی۔اپنا شناختی کارڈ بنوانے کے لیے۔کل رات ڈھائی بجے۔"،اس نے کہتے ہوئے لہجہ مدھم کیا تو ایمان کی آنکھوں میں نا سمجھی ابھری۔سوال بھی۔

"ڈھائی بجے؟وہ بھی رات کے؟"،اسے جیسے سمجھ نہ آیا تھا۔غزل نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"ہاں بھئی۔یہ پاکستان ہے۔اور اس سے بھی بڑی بات،یہ کراچی ہے۔"،اس نے شانے

اچکائے تھے۔ پھر ذرا سا قریب ہوئی تھی۔ "اپنا ڈومیسائل اور پی آر سی ریڈی رکھنا۔ پھر کل صبح یونیورسٹی کے ایڈمیشن کے لیے بھی جاؤ گی ثمرین کے ساتھ۔"، اور یہاں ایمان کا منہ بے ساختہ ہی کھلا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت ابھری تھی، پھر سوال، پھر ضد!

"مجھے پڑھنا نہیں ہے۔"، اس کے انداز میں ضدّی پن نجانے کہاں سے عود کر آیا تھا۔ ورنہ وہ بہت سادہ سی، سیدھی سی لڑکی تھی۔ کسی بات میں ضد نہیں کیا کرتی تھی۔

"تمہارے تو اچھے بھی پڑھیں گے۔"، غزل نے ابرو اٹھا کر لٹھے مار انداز میں کہا تو ایمان مسکرائی۔

"صحیح ہے۔ تو پھر آپ اچھوں کو ہی پڑھوالیں۔"، اس نے کہا تو غزل نے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"بدتمیز۔"، ایمان کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ وہ مذاق ہی کر رہی تھی۔ غزل جانتی تھی کہ وہ زندگی میں بہت کچھ کرنا چاہتی تھی۔ کچھ بننا چاہتی تھی۔ اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے لیے بہت کچھ سوچ رکھا تھا، مگر اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کیسے اپنے خوابوں تک

پہنچے گی۔ غزل بس اسی چیز میں اس کی مدد کر رہی تھی۔اس کے خوابوں تک پہنچنے میں۔

**"تاریکیٔ شب کے بعد دن کا اجالا جو لائے**

**نم آنکھوں کو ایک پل میں جو مسکراہٹ میں ڈھالے"**

منظر کورٹ روم کا ہے۔ بڑی اونچی سی بینچ پر سیاہ گاؤن پہنے ادھیڑ عمر سا جج بیٹھا تھا۔اس کے عین سامنے لگی نشستوں پہ کچھ لوگ براجمان تھے۔ایک جانب لگی کرسی پر سیاہ کوٹ پہنے عالم صاحب بیٹھے تھے جبکہ ان کے بالکل برابر میں فیضان بیٹھا تھا۔ سفید ڈریس شرٹ پہنے وہ سنجیدگی کا پتلا لگتا تھا۔ بھنویں تک ایک لکیر میں قید ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔آنکھوں میں ایک عجیب سا سمندر تھا جو خوب ٹھاٹھیں مار کر بھی خاموش محسوس ہوتا تھا۔ان کے پیچھے لگی نشستوں میں سے ایک پر ارشد کبیر بیٹھے تھے۔ سر اٹھا کر جج کو دیکھتے، وہ بہت سنجیدہ لگتے تھے۔

"عدالت کی کاروائی شروع کی جائے۔"، جج نے عام سے انداز میں ہتھوڑا پیٹ کر عدالت کی کاروائی کی ابتداء کی تھی۔عالم صاحب کوٹ کے بٹن بند کرتے میز کے پار سے نکلتے چل کر

سامنے آئے تھے۔ان کے چہرے پر بھی سنجیدگی رقم تھی۔انداز بتلاتا تھا کہ وہ اس عدالت سے ہر شے کی امید کر سکتے تھے۔یہ پاکستان کی عدالت تھی۔یہاں انصاف کم ہی ملا کرتا تھا۔

کاروائی شروع کی گئی تھی۔عالم صاحب نے اپنے تمام تر دلائل پیش کیے تھے۔اگلی جانب سے ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر اٹھ آیا تھا۔اب کے وہ اپنے دلائل پیش کر رہا تھا۔ہر شے کسی فاسٹ فارورڈ فلم کی طرح چلتی محسوس ہو رہی تھی۔ایک جانب فیضان سنجیدگی بھری سختی لیے سب دیکھ اور سن رہا تھا۔گزرتے ہر لمحے کے ساتھ ارشد صاحب کی سنجیدگی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ٹائپ رائٹر پہ سب کچھ ٹائپ ہوتا جا رہا تھا۔کافی طویل انتظار کے بعد جج صاحب نے عینک آنکھوں پہ پیچھے کو چڑھاتے ہوئے خاصے سلجھے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

www.novelsclubb.com

"مقتول کی اہلیہ کو بلایا جائے۔"،اور اب کے فیضان کی سخت سی آنکھوں میں کچھ نرمی جھلکی تھی۔ارشد صاحب کی آنکھیں بھی نم پڑی تھیں۔عالم صاحب ایک پل کو خاموش ہوئے تھے، اور پھر سے انہوں نے بولنا جاری رکھا تھا۔

"رمیص جہانزیب کی اہلیہ عدّت میں ہیں، یور آنر۔"،جج نے سمجھ کر سر ہلایا تھا، پھر وہ اپنے

سامنے رکھے کاغذات پر جھک گئے تھے۔کچھ منٹوں بعد انہوں نے سر اٹھا کر کمرۂ عدالت میں موجود لوگوں کو دیکھا تھا، پھر گلا کھنکار کر گویا ہوئے تھے۔

"تمام دلائل اور شواہد کے تحت عدالت اس نہج پر پہنچی ہے کہ رمیص جہانزیب کے ساتھ غلط کیا گیا تھا۔ان کا قتل ہی ہوا ہے۔فارینسک رپورٹس کو مدّ نظر رکھتے ہوئے یہ ثابت ہے کہ ان کو قتل ہی کیا گیا ہے، مگر ان کے وکیل کے مطابق جو یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ اس سب میں حکومت سندھ ملوث ہے، یہ صحیح ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ اگلی سماعت میں ہو گا۔تب تک وکیل صاحب سے کہا جاتا ہے کہ وہ مقتول کی اہلیہ کو سماعت کے لیے ریڈی رکھیں کیونکہ اس کیس میں ان کا ہونا نہایت ضروری ہے۔لہذا عدالت کی جانب سے اگلی پیشی ڈھائی ماہ بعد کی ہے۔تب تک مزید ثبوت اور گواہ لائے جائیں اور حکومت کے لیے بھی ایک نوٹس جاری کیا جائے۔۔۔"، کہتے ہوئے انہوں نے عالم صاحب کو اور پھر باری باری تمام لوگوں کو دیکھا تھا۔"عدالت برخاست ہوتی ہے۔"، کہتے ہوئے وہ گاؤن جھٹکتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

فیضان نے سنجیدگی سے عالم صاحب کو دیکھا تھا جو چہرہ پھیرے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ان کی

آنکھوں میں ایک بہت ہی واضح سی امید جھلکتی نظر آ رہی تھی۔ پھر اس نے چہرہ پھیر کر ارشد صاحب کو دیکھا تھا۔ وہ اٹھ کر ان تک ہی آ رہے تھے۔ ہاتھ جیبوں میں اڑس رکھے تھے۔ عالم صاحب نے انہیں مسکراتی نم آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ جو سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کو پہلی پیشی میں ہی نمٹا کر کیس ختم کر کے انہیں غلط ثابت کر دیا جائے گا، وہ غلط تھے۔ نجانے اللہ نے ان کے لیے اور رمیص کے لیے کیا سوچ رکھا تھا۔ مگر جو بھی سوچا تھا، وہ ان کو وقت آنے پر ہی معلوم پڑنا تھا۔ مگر امید کا ایک سرا تو نظر آ گیا تھا۔ اب انتظار اگلی پیشی کا تھا۔

**"روتے کا صبر کی تھپکی سے جو دل بہلائے**

**بے لگام آنسوؤں کو جو سرعت سے پونچھ ڈالے"**

وہ آج بھی تہجد کے پہر خدا تعالی کے حضور آ بیٹھی تھی۔ اپنا کشکول پھیلائے، اپنی نگاہیں اٹھائے۔ چہرے پر نرمی سی تھی۔ آنکھوں میں آج آنسو نہ تھے۔ آج وہاں ایک الوہی سی چمک رقصاں تھی۔ دل کے ایک گوشے میں انجانا سا اطمینان در آیا تھا۔ یہ احساس ہی خوش آئند تھا کہ جس

سیڑھی پر اس نے رمیص جہانزیب کے لیے قدم دھرے تھے، وہ سیڑھی اب اسے آگے ہی آگے لے جاتی جا رہی تھی۔ اسے اس ملک کی عدالتوں سے انصاف اور عدل کی کوئی امید نہیں تھی۔

وہ جانتی تھی کہ یہاں عدالتوں نے جتنی ناانصافیاں دیکھی تھیں، اتنی اور کسی جگہ نے نہیں دیکھی تھیں۔ مگر امید اسے اپنے اللہ سے تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اللہ اسے اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ اب سب لوگ اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ مگر کسی کے بھی ہونے سے اسے وہ اطمینان حاصل نہیں تھا جتنا صرف ایک اکیلے اللہ کے ہونے سے تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اللہ کا ساتھ سب سے بڑا اور مضبوط ساتھ ہے۔ وہ ساتھ ہو تو کون ساتھ نہیں، فرق نہیں پڑتا۔

اس نے ہاتھ دعا کے سے انداز میں اٹھائے تھے۔ نظریں اب بھی اٹھی ہوئی تھیں۔ اس پہر اللہ اس کو اپنے عین سامنے موجود محسوس ہوا تھا۔ گویا اللہ اس کے قریب، اس کے مقابل موجود اسے دیکھ رہا ہو، سن رہا ہو، سمجھ رہا ہو۔ پہر تہجد آسمانوں کا رب اسے سننے کے لیے، اس کے ساتھ موجود تھا۔ اس کے دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔

"میرے قدم مضبوط رکھنا، میرے اللہ۔ میری ڈھال تو بننا۔ دنیا کے ان وکیلوں اور ججوں کے سامنے میں نے تجھے اپنا وکیل مانا ہوا ہے۔ ان عدالتوں میں میرے لیے عدل تو قائم کرنا۔ ان منصفوں سے نہیں، امید تجھ سے ہے۔ میرے شوہر کو انصاف تو دلانا۔"، وہ آہستہ آہستہ، نہایت مدھم آواز میں کہتی جا رہی تھی اور اس کا رب اسے سنتا جا رہا تھا۔ وہی تو ہے جو تب بھی سنتا ہے جب ہم خاموش ہوں۔ وہی تو ہے جو تب بھی ہاتھ تھامے رکھتا ہے، جب سارے اپنے بھی چھوڑ جائیں۔ وہی تو ہے جو راستہ تب دکھاتا ہے جب تمام راہیں بند لگتی ہوں۔

ہاتھ اللہ تھام لے تو امیدیں دنیا والوں سے چھوڑ دینی چاہئیں۔ اس نے بھی دنیا والوں سے امیدیں چھوڑ دی تھیں۔ امید اس ایک اللہ سے لگالی تھی جو ان دنیا والوں پر قابض، ان کا مالک و خالق تھا۔

"وہ تیغ ایمانی، وہ شمشیر ہے یہ امید

وہ خوشی ہے امید، وہ ہنسی ہے امید"

رضا اب کمبل اوڑھے چت لیٹا اوپر سیلنگ کو دیکھ رہا تھا۔ کمرہ یوں تو اندھیر تھا مگر باہر سے منعکس ہو کر اندر آتی روشنی سے ہر شے ہیولے نما سے سائے کی مانند لگتی تھی۔ اس کی شہد رنگ آنکھیں خاموش تھیں۔ خاموشی ان میں بسیرا کر چکی تھی۔ اس کے کانوں میں لگے ایئر پوڈس میں اب رمیص جہانزیب آخری کے الفاظ ادا کر رہا تھا۔

"یہ امید جو ہے ناں، یہ ایک اندھے کو بھی روشنی دکھا دے۔ امید کی شمشیر تیز دھاری ہوتی ہے۔ سارے مایوسیوں کو کاٹ ڈالتی ہے۔ یہ روتے ہوئے انسان کو ہنسانے کا ہنر رکھتی ہے۔ دکھی انسان کو خوشی کی راہ دکھلاتی ہے۔ امید کا دامن تھامے رکھو۔ یہ ایمان کا ایک اہم جزو ہے۔ لوگوں کو ڈھے جانے سے بچائے رکھتی ہے۔ مایوسیوں میں گھر جانے سے روکے رکھتی ہے۔ دعاؤں میں یاد رکھئے گا، پاکستان۔ خدا حافظ۔"، رمیص خاموش ہوا تو رضا نے ایئر پوڈس باری باری دونوں کانوں سے نکالے تھے، پھر بازو لمبا کر کے دھیرے سے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیئے تھے۔ آنکھیں سونے کے لیے بند کر دی تھیں۔

باہر رات قطرہ قطرہ پگھلتی جا رہی تھی۔ اگلی صبح کا انتظار کرتی۔ تارے جھلملاتے جا رہے تھے۔

www.novelsclubb.com

رات کی تاریکی گہری ہوتی چلی گئی تھی۔لندن کی روشنیاں بھی دھیرے دھیرے مدھم پڑنے لگی تھیں۔

جاری ہے۔۔۔

www.novelsclubb.com

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک، انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP: